سیرتِ فریدیہ

حالاتِ زندگی نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین
احمد خان بہادر مصلح جنگ وزیر ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی

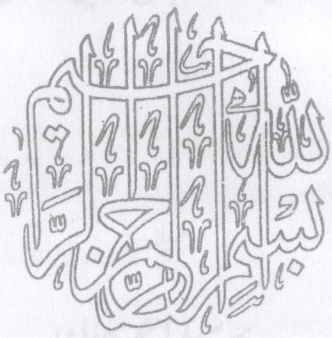
مؤلف

سر سید احمد خان

مرتب

محمود احمد برکاتی

قرطاس


بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرتِ فریدیہ

(حالاتِ زندگی نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ وزیر ابونصر معین
الدین اکبر شاہ ثانی)

مولف:

سر سید احمد خان

مرتب:

محمود احمد برکاتی

قرطاس

سیرة فریدیہ

یعنی

حالات زندگی

نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر

مصلح جنگ

وزیر

ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

مولفہ

ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر ایل۔ ایل۔ ڈی، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی

موروثی خطاب شاہی

جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام قادر علی خاں صوفی طبع شد

۱۸۹۶ء

(۱۸۹۶ء کی طباعت کی عبارت)

اشاعت ثانی کے بارے میں حرفے چند

میں نے ۱۹۶۴ء میں بعض احباب کی فرمائش پر سرسید مرحوم کے رسالہ ''سیرت فریدیہ'' کو مدوّن کیا تھا اور اس سلسلہ میں رسالے کی اولین طباعت ۱۸۹۶ء پیشِ نظر تھی۔ میں نے اپنے مقدمہ میں سرسید کی علمی، سیاسی زندگی اور سوانح پر اپنے نتائج فکر و مطالعہ پیش کیئے تھے۔ متن پر کچھ حواشی تحریر کیئے تھے اور آخر میں رسالے میں مذکور اشخاص و رجال کے حالات مختصراً تحریر کر دیئے تھے۔

اب میرے فاضل دوست جناب ڈاکٹر منیر واسطی صاحب اس کی نئی طباعت کا اہتمام فرما رہے ہیں تو میں نے مقدمے اور حواشی میں کسی قدر تبدیلی کر دی ہے۔ آخر میں متن کا اشاریہ بھی دیا جا رہا ہے جو پہلی بار نہیں دیا جا سکا تھا۔ اس اشاعت کے لیئے نئے اشاریہ کی ترتیب کے لیئے میں عزیزہ (ڈاکٹر) نگار سجاد ظہیر کے تعاون کا مشکور ہوں۔

محمود احمد

۲۱، مارچ ۲۰۰۹ء

فہرست مضامین

ابتدائیہ	مرتب	۱۱
سرسید۔۔۔۔افکار و کردار	"	۱۳
خواجہ فریدالدین	"	۳۴
سیرت فریدیہ پر تبصرہ	"	۴۱
سیرت فریدیہ (متن) سرسید احمد خاں		۴۸
خواجہ یوسف ہمدانی		۵۰
یوسف کی اولاد کشمیر میں		۵۰
ولادت و خاندان		۵۱
خواجہ فرید کے سات بھائی		۵۱
خواجہ فرید لکھنؤ میں		۵۲
علامہ تفضل حسین خاں		۵۳
خواجہ فرید کی شادی		۵۳
پھر لکھنؤ کی طرف		۵۴
فوائدالافکار کا دیباچہ		۵۴
مدرسۂ کلکتہ کی ملازمت		۵۸
زمان شاہ کا عزم پشاور		۵۸
انگریزوں کا شاہ ایران سے معاہدہ		۵۹
بمبئی میں سفیر ایران کا قتل		۵۹
دلزلی کی سفیر کے ورثا سے تعزیت		۶۰

حشمت جنگ سفیر انگریز کا عزل	۶۰
ایران میں مالکم کی سفارت	۶۱
خواجہ فرید۔ وفد ایران میں	۶۲
ایرانی سفیر ہندوستان میں	۶۳
سفیر ایران سے خواجہ فرید کی دوستی	۶۴
خواجہ فرید کی کلکتہ واپسی اور سفر برما	۶۵
بندیل کھنڈ میں تحصیل داری	۶۵
دہلی واپسی	۶۵
شاہ عالم ثانی	۶۵
دہلی پر انگریزوں کا قبضہ	۶۷
مرزا جہاں گیر کا قضیہ	۶۸
اکبر شاہ ثانی کی ''درخواست'' نامنظور	۶۹
خواجہ فرید پھر کلکتہ میں	۶۹
اکبر شاہ ثانی کی تنگ حالی	۶۹
خواجہ فرید کی وزارت	۷۰
خواجہ نے شاہ کی مشکلات کے حل ڈھونڈ لئے	۷۰
اہلِ قلعہ کی ناخوشی	۷۱
خواجہ فرید کا استعفا	۷۱
دوبارہ وزارت	۷۲
ایک یادگار تصویر	۷۳
آکٹرلونی	۷۳

رام موہن رائے ۷۴
بہادر شاہ بھی ناکام رہے ۷۵
ناکامی کا اصلی سبب ۷۵
رنجیت سنگھ کی خواجہ فرید کو دعوت وزارت ۷۵
وفات ۷۶
تاریخ وفات ۷۶
خواجہ فرید کے تلامذہ ۷۷
کتب خانہ ۷۸
انگریزی زبان سے واقفیت ۷۸
خواجہ فرید کے رسائل ۷۸
بخشی محمود خاں ۷۹
خواجہ فرید کے معمولات ۸۰
سرسید کا سبق ۸۱
مکا شاہ کے مرید تھے ۸۱
چار ابرد کا صفایا ۸۲
لالہ ملوک چند ۸۲
خواجہ وحید الدین ۸۲
خواجہ زین العابدین ۸۳
خواجہ فرید کی اولاد اناث ۸۷
والدۂ سرسیّد ۸۷
مرتب ۹۷

رسول شاہ ۹۸
مولوی محمد حنیف ۹۹
علامہ تفضل حسین خاں ۱۰۰
راجہ رام موہن رائے ۱۰۱
حکیم احسن اللہ خاں ۱۰۲
مولوی کرامت علی ۱۰۴
رجب علی ۱۰۵
خواجہ محمد نصیر ۱۰۶
حکیم رستم علی خاں ۱۰۶
خواجہ وحید الدین ۱۰۷
نواب زین العابدین خاں ۱۰۷
میر ناصر احمد ۱۰۸
ہمت خاں ۱۰۸
راگ رس خاں ۱۰۸
حکیم غلام نجف خاں ۱۰۸
شاہ محمود آفاق ۱۱۱
خواجہ علاؤالدین احمد ۱۱۲
فدا حسین ۱۱۳
حواشی ۱۱۵
کتابیات ۱۲۳
اشاریہ ۱۲۶

مرتب
ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

ابتدائیہ

سیرت فریدیہ ١٨٩٦ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس کی دوسری اشاعت اب ١٩٦٤ء میں کی جارہی ہے۔

کتاب کئی اعتبارات سے قابلِ اعتنا ہے، مگر کم یاب تھی اس لئے اشاعت کا اہتمام کیا گیا اور چند اغلاط و نقائص کی حامل تھی اس لئے تحشیہ کی ضرورت ہوئی۔

مقدمہ کی تین فصلوں میں بہ ترتیب (١) سرسیدؒ (٢) خواجہ فریدالدین (٣) اور سیرت فریدیہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

سرسیدؒ کے افکار و کردار کے جائزے سے غالباً نہ آپ مطمئن ہوں گے نہ متفق، مگر اسے ایک نقطۂ نظر کی حیثیت سے مطالعہ فرمائیے۔ آخر اب تک صرف ایک نقطۂ نظر کا مطالعہ بھی تو کرتے رہے ہیں۔

مجھے سرسیدؒ سے کوئی نفرت نہیں ہے، ہاں بہت سی ہستیوں سے محبت ہے، بہت سے بزرگوں سے عقیدت ہے اور بہت سے مظلوموں سے ہمدردی ہے۔ اور ان کے دفاع میں غفلت و پس و پیش میرے یہاں ناروا ہے اور ہاں مجھے نفرت بھی ہے۔ ''مغربیت'' سے مگر مغرب زدوں سے نہیں، طبیب صرف مرض سے جنگ کرتا ہے، مریض سے ہمدردی اس کے فرائض میں داخل ہے، مجھے کالے اور گورے دونوں قسم کے فرنگیوں سے ہمدردی ہے اور اسی ہمدردی کے وفور و جوش میں کبھی میری نوکِ قلم پر ''دوائے تلخ'' ہوتی ہے اور کبھی میری انگلیوں میں نشتر جراحت ۔۔۔۔ کیا کروں؟

میں نے سرسیّد سے اختلاف کیا ہے اور بے محابا کیا ہے، مگر سوء ظن اور سوء ادب کی ارادی سعی نہیں کی، ، لغزشوں اور فرد گذاشتوں پر گرفت کرنا خود انہی کے طرز فکر و عمل کی اقتدا ہے، ہاں میرا لہجہ وہاں شاید تند ہو گیا ہو جہاں ان کے سیاسی کردار کا جائزہ لیا ہے مگر امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔ شہداء حریت کی شان میں سرسیّد کی گستاخیوں کو بھی تو آپ نے معاف کر دیا تھا۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سرسیّد سے مجھے نفرت نہیں ہے، سچی بات یہ ہے کہ محبت بھی نہیں ہے، نظیری کو بھی نہیں تھی۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

سیرت فریدیہ کی ترتیب و تحشی کا کام میں نے اپنے فاضل دوست جناب محمد ایوب قادری۔ ایم، اے کے حکم سے کیا ہے۔

مجھ سے غالب یہ علائی نے ''غزل'' لکھوائی!

اور میرے شامل حال ان کی ہر نوع کی اعانت رہی ہے اتنی اعانت کہ وہ میرے شریک غالب یعنی صہبائی رہے ہیں۔

محمود احمد

برکاتی دواخانہ۔ لیاقت آباد ۴ کراچی ۱۹

یکم جنوری ۱۹۶۴ء

سر سیّد

افکار و کردار

نجی زندگی ایک نظر میں

سر سیّد کے نجی احوال و سوانح کے سلسلے میں تفصیل میں جانے کے بجائے یہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیات پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔

۱۸۱۷ء میں ولادت۔

۱۸۲۲ء میں آغاز تعلیم، ایک عورت سے، (۵ سال کی عمر میں)۔

۱۸۲۸ء میں نانا کی وفات۔

۱۸۳۵،۳۴ء میں ازدواج (۱۷ یا ۱۸ برس کی عمر میں حالؔی)

۱۸۳۵ء میں ترک تعلیم (۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں حالؔی)

۱۸۳۷ء میں بڑے بھائی سیّد محمد خاں بہادر کے اخبار (''سید الاخبار'') کا اجراء۔

۱۸۳۸ء میں والد (سیّد محمد متقی خاں بہادر) کی وفات اور صدر امین دہلی کے دفتر میں سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازمت (''۲۲ سال کی عمر میں'' حالؔی)

۱۸۳۹ء میں کمشنری کے نائب منشی کی حیثیت سے آگرہ تبادلہ۔

۱۸۴۰،۱۸۳۹ء میں امتحان منصفی۔

۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصب پر تعین۔

۱۸۴۲ء میں فتح پور سیکری تبادلہ، مغل دربار سے ''جواد الدولہ عارف جنگ'' کا خطاب۔

۱۸۴۵ء میں بڑے بھائی کی رحلت۔

۱۸۴۶ء میں دہلی تبادلہ اور تجدید طلب علم۔

۱۸۴۹ء میں سید حامد کی ولادت۔

۱۸۵۰ء میں سید محمود کی ولادت۔

۱۸۵۵ء میں صدر امین کی حیثیت سے بجنور تبادلہ۔

۱۸۵۷ء میں والدہ کا انتقال۔

۱۸۵۸ء میں صدر الصدور ہو کر مراد آباد تبادلہ۔

۱۸۶۱ء میں اہلیہ کا انتقال۔

۱۸۶۲ء میں غازی پور تبادلہ۔

۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلہ

۱۸۶۷ء میں بنارس تبادلہ۔

۱۸۶۹ء میں سفر فرنگ، سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب۔

۱۸۷۰ء میں مراجعت وطن۔

۱۸۷۶ء میں ۳۷ برس کی ملازمت کے بعد چھ سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ۔

۱۸۷۸ء میں وائس رائنگل لیجس لیٹو کونسل کی رکنیت۔

۱۸۸۸ء میں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب

۱۸۸۹ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی (ڈاکٹر آف لاز) کی ڈگری۔

۱۸۹۸ء میں وفات (۸۱ برس کی عمر میں)

نجی زندگی پر ایک نظر

شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اگر انسان کے عہد طفلی اور دور نوجوانی کے احوال و حوادث خاندانی ماحول، بزرگان خاندان، اساتذہ وغیرہ حصہ لیتے ہیں اور ضرور لیتے ہیں تو سر سیّد کی اس داستان حیات میں حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

سر سیّد کی پرورش ددھیال میں نہیں ننھیال میں ہوئی مگر وہ ابھی گیارہ برس ہی کے تھے کہ نانا

چل بسے، والد ایک آزاد طبیعت آدمی تھے اس لئے تعلیم و تربیت پر باقاعدہ توجہ نہ دی جاسکی، ۱۷ یا ۱۸ برس کی عمر میں شادی ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ ۲۲ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسی سال ملازمت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی، ملازمت میں دور دراز کے اضلاع میں تبادلے ہوتے رہے سات آٹھ سال بعد بڑے بھائی داغِ جدائی دے گئے۔ اب گھر کے مردوں میں سب سے بڑے یہی تھے، والدہ سے بہت مانوس تھے ۱۸۵۷ء میں ان کی محبت و شفقت کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا۔ کل ۱۸ برس متاہلانہ زندگی کے نصیب ہوئے زندگی کے باقی ۳۷ سال شریکۂ حیات کی رفاقتوں اور دل جوئیوں سے محروم رہے۔ زندگی کے آخری چند سال سید محمود کی صحت جسم و دماغ کی طرف سے یاس والم میں گذارے۔

علمی زندگی ایک نظر میں

۱۸۲۲ء میں رسم بسم اللہ

۱۸۳۵ء میں۔ ازدواج کے بعد سلسلہ تعلیم ختم کردیا۔

۱۸۳۷ء میں سید محمد خاں کے اخبار کا اجراء

۱۸۳۹ء میں ''جام جم'' کے نام سے اپنی پہلی کتاب مرتب کی جو فارسی زبان میں تیموری سلاطین کی ایک جدول کا نام ہے، یہ کتاب ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ نیز ''قواعد صرف ونحو زبان اردو'' لکھی

۱۸۴۰ء میں قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا خلاصہ، بڑے بھائی کی مدد سے مرتب کر کے ''انتخاب الاخوین'' کے نام سے شائع کیا۔

۱۸۴۳ء میں ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' کے نام سے ایک ''میلاد شریف'' لکھا۔

۱۸۴۴ء میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے باب دہم و دواز دہم کا اردو ترجمہ ''تحفۂ حسن'' کے نام سے کیا، اسی سال عربی کے ایک رسالہ کے فارسی ترجمہ کا اردو ''التسہیل فی جر الثقیل'' کے نام سے مولوی نور الحسن کان دہلوی کی مدد سے کیا۔

۱۸۴۶ء میں دہلی تبادلہ ہونے پر دوبارہ تحصیل علم کا آغاز کیا۔ اسی سال اپنے نانا کے ایک فارسی رسالہ ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' کا اردو ترجمہ کیا۔

۱۸۴۷ء میں (۳۰ سال کی عمر میں) دہلی کے تقریباً دو سو عمارات اور ایک سو بیس مشاہیر حال و ماضی قریب پر مشتمل ''آثار الصنادید'' مرتب و شائع کی۔

۱۸۴۸ء میں ''القول المتین در حرکت الزمین'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

۱۸۴۹ء میں ''کلمتہ الحق'' کے نام سے پیری و مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے خلاف ایک رسالہ مرتب کیا، ایک رسالہ ''ترجمہ فیصلہ جات صدر مشرقی و صدر مغربی'' شائع کیا۔

۱۸۵۰ء میں ''راہِ سنت در رد بدعت''، ''اہل بدعت کے خلاف متبعین سنت کی تائید میں'' ایک رسالہ لکھا جو اصل میں شاہ اسمعیل شہید کے رسالہ ''ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح'' سے ماخوذ ہے۔

۱۸۵۲ء میں، تصور شیخ کے جواز وحمایت میں ''نمیقہ'' کے عنوان سے فارسی میں ایک رسالہ تالیف کیا اسی سال دہلی کے پانچ ہزار سالہ فرماں رواؤں کا جدول ''مسلسلة الملکوک'' شائع کیا۔

۱۸۵۳ء میں امام غزالی کی کیمیاء سعادت کے چند ابتدائی اوراق کا اردو ترجمہ کیا۔

۱۸۵۶ء میں، بجنور کی تاریخ مرتب کی، اسی سال ان کی مدون کی ہوئی ''آئین اکبری'' (ابوالفضل) کی پہلی اور تیسری جلدیں شائع ہوئیں۔

۱۸۵۷ء میں آئین اکبری دوسری جلد مدون کر کے مطبع کے حوالہ کی مگر دوران طباعت ضائع ہوگئی

۱۸۵۸ء میں ''تاریخ سرکشی بجنور'' مرتب و شائع کی۔

۱۸۵۹ء میں، رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' شائع کیا۔

۱۸۶۰ء۔۱۸۶۱ء میں ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے نام سے رسائل کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے کُل ۳ شمارے (۲۷۳ صفحات پر مشتمل) شائع ہو سکے۔ ان میں ۲۲ مسلمانوں کی وفاکیشیوں کا بیان

ہے ان ۲۲ میں سب سے پہلے خود سر سیّد ہیں، اسی سال رسالہ ''تحقیق نصاری'' اردو اور انگریزی میں شائع کیا۔

۱۸۶۲ء میں ''تاریخ فیروز شاہی'' کی تصحیح و تدوین کر کے شائع کی، اسی سال تفسیر اناجیل (تبئین الکلام) لکھی۔

۱۸۶۴ء میں تزک جہانگیری غازی پور سے شائع کی۔

۱۸۶۷ء میں رسالہ ہیضہ ''بطریق ہومیاپاتک'' شائع کیا۔

۱۸۶۸ء میں ''رسالہ طعام اہل کتاب'' تالیف کیا۔

۱۸۷۰ء میں سرولیم میور کی ''لائف آف محمد ﷺ'' کی چار جلدوں میں سے ایک کا جواب اردو میں لکھ کر اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کروا کے لندن سے شائع کیا، اسی سال سفر فرنگ سے واپس لوٹتے ہی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جو ۱۸۷۷ء تک نکلتا رہا، اس سات سال میں سر سیّد نے اس میں ۱۱۲ مضامین لکھے۔

۱۸۷۱-۷۲ء میں ہنٹر کی کتاب ''اور انڈین مسلمانز'' پر تنقید اردو اور انگریزی میں شائع کی، اسی سال ''رسالہ ابطال غلامی'' شائع کیا۔

۱۸۷۲ء ''الخطبات الاحمدیہ'' (ولیم میور کی کتاب کا جواب) کا اردو ایڈیشن شائع کیا۔

۱۸۷۹ء میں تہذیب الاخلاق کے دورِ جدید کا آغاز کیا، اب کے یہ رسالہ ۲۹ مہینے (جولائی ۱۸۸۷ء تک) جاری رہا اس عرصہ میں سر سیّد نے اس میں ۲۳ مضامین لکھے۔

۱۸۸۰ء میں تفسیر قرآن کی پہلی جلد شائع کی۔

۱۸۸۱ء میں ''النظر فی بعض مسائل امام غزالی'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔

۱۸۹۰ء میں ''ازالۃ الغین فی قصہ ذی القرنین'' اور ''الترقیم فی اصحاب الکہف والرقیم'' کے نام سے دو رسائل تحریر کئے، تفسیر قرآن کی جلد ششم شائع کی۔

۱۸۹۲ء میں ''الدعا والاستجابۃ'' اور ''التحریر فی اصول التفسیر'' کے نام سے دو رسائل لکھے۔

۱۸۹۳ء میں اپنے نانا کی سوانح۔۔۔سیرت فریدیہ۔۔۔ترتیب دی جو ۱۸۹۶ء میں چھپی۔

۱۸۹۴ء میں تہذیب الاخلاق کے دور سوم کا آغاز ہوا اب کے یہ ۱۸۹۷ء تک نکلتا رہا۔ اس تین سال کے عرصے میں ۳۶ شماروں میں ایک سو تین مضامین شائع ہوئے۔ جن میں سے ۷۳ سرسیّد کے لکھے ہوئے تھے۔

علمی زندگی پر ایک نظر

یہ تھی سرسیّد کی علمی زندگی:۔ اس کے دو حصے کیجئے (۱) تحصیل و تعلم (۲) تصنیف و تحریر، پہلے سرسیّد کے نظام تحصیل و تعلیم کا جائزہ لیجئے، ۵ سال کی عمر سے ۱۸ سال کی عمر تک طلب علم میں بسر کیے مگر حقیقی سرپرست نانا کے انتقال، والد کی آزادگی اور اپنی خودرائی اور عدم استقلال کی وجہ سے تعلیم غیر مرتب و ناقص اور نامکمل و ناکافی رہی (۱)۔ غیر معروف اور وصف دوم کے اساتذہ میسّر آئے۔ فنون اور کتب کا انتخاب شاید خود ہی کرتے رہے اس لئے کئی اہم اور اساسی فنون (۲) کو سرے سے چھوا ہی نہیں، کئی فنون میں کتابوں کا انتخاب غیر مرتب انداز میں کیا گیا، ۲۹ سال کی عمر میں دوبارہ طلب علم کی طرف متوجہ ہوئے بھی تو اس "لف ونشر غیر مرتب" کے انداز میں کہ ادھر آثار الصنادید کی تسوید و ترتیب ہورہی ہے ادھر منصفی کے فرائض ادا کر رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بعض علماء اور بعض طلبہ سے کوئی نہ کوئی سبق بھی لے رہے ہیں۔

یہی رنگ تصنیف و تحریر کا بھی ہے

وہ محنت کی عادی، سراپا عمل، جدت پسند اور غالباً مصنف کہلائے جانے کے آرزومند تھے۔ دہلی میں ۱۸۲۳ء سے پریس کا رواج (۳) ہو چکا تھا۔ اس لئے کتاب لکھنے کے فوراً بعد طباعت کا اہتمام ہو سکتا تھا، معرکوں اور مباحثوں میں حصہ لینے کا ولولہ تھا ۱۸۳۷ء میں ان کے گھر سے ایک اخبار جاری ہوا تھا اور یہی ان کی قلم کاری کی اولین جولان گاہ تھی اس کے دو سال بعد، ۲۳ برس کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی تصنیف مکمل کی، گویا تقریباً بیس برس کی عمر سے زندگی کے آخری لمحات تک، ساٹھ

برس ان کے ہاتھ میں قلم رہا۔

تصانیف کی فہرست پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ دائرہ تحریر، تاریخ اور مسائل اختلافیہ پر محیط ہے، جام جم، سلسلۃ الملوک، آثار الصنادید، تزک جہاں گیری، تاریخ بجنور، تاریخ سرکشی بجنور، لائل محمدنز، تاریخ فیروز شاہی، خطبات احمدیہ، سیرت فریدیہ وغیرہ کا موضوع تاریخ و سیرت ہے۔ باقی اکثر رسائل و کتب میں، سیاسی، مذہبی اور وطنی مسائل اختلافیہ پر تردید و تائید میں اظہار خیال و رائے کیا گیا ہے۔

معرکوں میں حصہ لینے کا ولولہ اور مداخلت کا شوق، ان کو اپنے رجحان طبع مبلغ علم اور دائرہ خبر و آگاہی ہر چیز سے غافل کر دیتا تھا، تحصیل علوم کی تکمیل تو وہ کر ہی نہیں سکے، مگر ۱۸۴۶ء میں اس طرف قدرے توجہ دے سکتے تھے۔ مگر اس وقت تک سات رسالوں کے مؤلف و مصنف بن چکے تھے اور آٹھویں کتاب (آثار) کی ترتیب میں مشغول تھے، ان سات رسالوں میں سے دو رسالے خلافیات کے سلسلے کے تھے، آثار کے بعد بترتیب جو چار رسائل تحریر کئے وہ سب اپنے وقت کے معرکۂ آرا مسائل پر تھے۔

وہ دھن کے پکے، عجلت پسند اور کام کو کسی پیمانے پر کر ڈالنے کے قائل تھے۔ اس لئے ان کی بیشتر کتابیں باعتبار موضوع و ماخذ و نوعیت وغیرہ ایسی نہ تھیں کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوتے اور اسی لئے ان کی متعدد تصانیف میں ہم دوسروں کو شریک پاتے ہیں، انتخاب الاخوین کا تو نام ہی صراحت کر رہا ہے کہ وہ دونوں کی بھائیوں کی مشترک مساعی کا نتیجہ ہے، آثار کے متعلق حالؔی کا بیان ہے کہ سر سیّد خود اقرار کرتے تھے کہ

"اس کی عبارت مولینا صہبائی کی لکھی ہوئی ہے" (جلد ۲، ص ۲۲۹)

مواد جمع کرنے اور کتبات پڑھنے میں صہبائی کی شرکت کا بھی خود سر سیّد نے اقرار کیا ہے گویا آثار کی تالیف میں صہبائی برابر کے شریک ہیں، تفسیر قرآن کے لئے مولوی وحید الدین سلیم، کتب احادیث سے متعلقہ مواد فراہم کیا کرتے تھے (حیات جاوید جلد ۲، ص ۳۲۵) خطبات احمدیہ کے لئے

محسن الملک مولوی سید مہدی علی ہند سے انگلستان مواد بھیجا کرتے تھے (حیات جاوید، ص ۶۲۳) تفسیر اناجیل کے لئے ''کتب احادیث وتفسیر سے سندیں بہم پہنچانے کے لئے ایک عربی داں عالم کونوکر رکھا تھا'' (حیاتِ جاوید، ص ۸۷) اس کتاب کے لئے ایک یہودی عالم سالم کی خدمات بھی حاصل کی تھیں (۴)۔

بات یہ ہے کہ جس کام کو وہ ضروری تصور کر لیتے تھے اس کا ضرورت کا شدید احساس اور اہل و باصلاحیت اصحاب قلم کی کاہلی اور عدم توجہ انھیں مجبور کر کے میدان میں لے آتی تھی، اور وہ تیغ قلم کو بے نیام کر کے کمر بستہ ہو جاتے تھے پھر نہ انھیں متعلقہ زبانوں اور علوم میں اپنی دست رس کا خیال رہتا تھا نہ کثرت مشاغل، کم یابی کتب، تساہل رفقا اور دوسرے موانع کا۔ چنانچہ جب ایک ایسی کتاب (لائف آف محمد ﷺ کا جواب لکھنے کا ارادہ، جس کو پڑھ کر سمجھ لینا بھی ان کے لئے سہل نہ تھا تو اپنے ذی علم احباب کو بار بار اس طرف متوجہ کیا مگر جب کوئی بھی آمادہ نہ ہوا (۵) تو خود ہی ہمت کر کے ڈٹ گئے اور اس ''بے سروسامانی'' کے ساتھ کہ دینی علوم سے بہرہ مند تھے نہ مغربی علوم سے آشنا، عربی پر قدرت رکھتے تھے نہ انگریزی میں درک، نہ ماخذ کی خبر نہ ان تک رسائی، مگر اس اللہ کے بندے نے ہمت نہ ہاری، تمام موانع پر قابو حاصل کیا، تمام مشکلات کو عبور اور ولیم میور کے ہذیانات کا جواب لکھ کر دم لیا اور یوں سردار دوجہاں ﷺ کے دربار میں سرخ رو ہوئے۔ سیرت نبوی کی ایک اہم خدمت انجام دی۔

حالی نے صراحت کی ہے کہ دست خط کر لینے کے سوا انگریزی نہیں جانتے تھے (ص ۱۹۱ و ۲۱۱ حیات جاوید) مگر اس کے باوجود ۱۸۵۹ء میں ہندوستانیوں کو اردو میں تعلیم دینے کے خلاف ایک مضمون اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا، ۱۸۷۰ء میں خطبات احمدیہ کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا، ۷۲-۱۸۷۱ء میں ہنٹر کی کتاب انگریزی میں تنقید کی۔

اجتماعی وسیاسی زندگی ایک نظر میں

۱۸۵۷ء میں، بجنور میں، فرنگیوں کی اعانت اور ''باغیوں'' اور ''سرکشوں'' کی سرکوبی میں جہد بلیغ کی، اس جاں نثاری کے صلے میں ایک ہزار کی قیمت کا خلعت اور دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ (دونسلوں تک) پایا ۱۸۵۸ء میں ''سرکشی بجنور'' کی داستان لکھی اور چھاپی۔

۱۸۵۹ء میں، فارسی کا ایک مدرسہ قائم کیا، انہی دنوں انگریزی اور اردو میں ایک مضمون لکھ کر شائع کیا کہ حکومت نے ہندوستانیوں کو اردو میں تعلیم دینے کا جو سلسلہ رائج کیا ہے وہ غلط ہے، کیونکہ (۱) نہ اردو میں علمی کتابیں ہیں (۲) نہ اس زبان میں یہ صلاحیت ہی ہے کہ اس میں علمی تصنیف و تالیف کی جاسکے (۳) نہ یہ خوبی ہے کہ اس میں علم حاصل کرنے کے بعد جودت طبع، حدت ذہن، سلامت فکر ملکۂ عالی، قوت ناطقہ کی پختگی، تقریر اور ترتیب دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے۔'' (حیات جاوید، ص ۷۰) اسی سال اُنہوں نے اپنی زندگی کی پہلی پبلک تقریر کی جس میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان امن کا شکریہ ادا کیا، اسی سال رسالۂ اسباب ''بغاوت ہند'' طبع کرا کے پارلیمنٹ کے ارکان میں شائع کیا۔

۱۸۶۰۔۶۱ء میں ''لائل محمڈنز اوف انڈیا'' کے نام سے ایک سلسلہ رسائل شروع کیا جو مفصلائٹ پریس آگرہ میں چھپا تھا، اسی زمانے میں ''تحقیق نصاری'' پر ایک رسالہ لکھا۔

۱۸۶۳ء میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی، اس سال سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے کلکتہ کا سفر کیا۔

۱۸۶۶ء میں ''علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۶۷ء میں ''ورنیکلر یونیورسٹی'' کی مہم شروع کی، اسی سال اردو زبان و رسم الخط کے حمایت میں مختلف قائدین ہنود سے مراسلت اور اخبارات میں مضامین کا تبادلہ کرتے رہے، اسی سال ہومیو پیتھی (ایک جدید تر و عجیب تر طریق علاج) کی ترویج کی طرف متوجہ ہوئے اس کے لئے ایک انجمن بنائی ایک شفاخانہ جاری کیا، ایک رسالہ لکھا۔

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک سفر فرنگ پر رہے وہاں:۔

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو ''کمپنین آف دی اسٹار آف انڈیا'' سے معزز و ممتاز فرمایا، اب میں احباب کی دعا سے ''سید احمد خاں بہادر سی، ایس، آئی'' ہوگیا۔ اس موقع پر تمام معزز انگریز دوستوں نے مبارک باد دی، اس درجہ کی دی ہے اور ایسا معزز خیال کیا ہے کہ یہاں (لندن) سے باہر لارڈ لارنس نئے گورنر جنرل نے میرے لئے جلسہ مقرر کیا اور بڑے بڑے رؤسا اور مدبروں کو بلایا۔'' خطوط سرسید، ص ۲۶

اسی سال ''کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان ہند'' ترتیب دی۔ اسی سال کمیٹی خزانتہ البضاعۃ لتاسیس مدرستہ المسلمین'' قائم کی۔

۲۔ ۱۸۷۱ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب اور انڈین مسلمانز'' کا جواب اردو اور انگریزی میں لکھا

۱۸۷۵ء میں، ملکہ معظمہ کی سال گرہ کے دن (۲۴ مئی کو) ''مدرستہ العلوم مسلمانان'' کی بنیاد رکھی۔

۱۸۷۸ء میں اس درس گاہ کو اسکول سے کالج بنایا، اسی سال وائس رائگل لیجس لیٹیو کونسل کے رکن منتخب ہوئے (اور مسلسل چار سال تک رکن رہے)۔

۱۸۷۹ء میں ایک مسودۂ قانون پیش کر کے منظور کروایا کہ ملک میں چیچک کے ٹیکہ کا جبری نفاذ کیا جائے، ایک اور مسودۂ قانون (وقف خان دانی کے متعلق) پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کی تیاری اور اعلان بھی کر چکے تھے مگر ایک قانونی رکاوٹ کی وجہ سے پیش نہ کر سکے۔

۱۸۸۰ء میں تقرر قضاۃ کے لئے ایک مسودۂ پیش کیا اور وہ منظور ہوگیا۔

۱۸۸۳ء میں ''محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن'' قائم کی اسی سال ''علی گڑھ محمڈن ایسوسی

ایشن'' قائم کی۔

۱۸۸۶ء میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس'' قائم کی۔

۱۸۸۸ء میں ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' قائم کی، اسی سال نائٹ کمانڈر اوف دی اسٹار اوف انڈیا'' (کے، سی، ایس، آئی) کا خطاب ملا۔

۱۸۸۹ء میں اڈنبرا یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر اوف لاز (ایل، ایل، ڈی) کی ڈگری ملی۔

۱۸۹۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن منتخب کئے گئے۔

۱۸۹۸ء میں جب عالم آخرت کا رخ کیا تو ایک عیسائی کی کتاب (امہات المومنین) کا رد زیر قلم تھا۔

اجتماعی وسیاسی زندگی پر ایک نظر

سر سیّد نے بدو شعور سے حیات کے لمحات آخریں تک ''ہر جہتی جنگ'' کا سلسلہ دراز رکھا، ان کے تحریری کارناموں کے متعلق عرض کیا جاچکا ہے کہ بیکِ وقت کئی کئی محاذوں پر وہ سرگرم ستیز رہے، متعدد فنون میں اُنہوں نے تردید و تائید کی بازیاں لڑیں، حیات کے متنوع شعبوں میں اصلاح و تغیر کے لئے وہ ساعی و داعی رہے سب سے پہلے مروجہ میلاد ناموں اور ان کی نامعتبر و غیر صحیح روایات کے خلاف علم اختلاف لہرایا اور صحیح و مستند روایات پر مشتمل ایک نیا میلاد نامہ۔ جلاء القلوب۔ تالیف کیا۔ یہ واعظوں سے ان کی ٹکر تھی، پھر شاہ عبد العزیز دہلوی کی ہنگامہ آرا کتاب تحفہ اثنا عشریہ کے دو خاص ابواب کا اردو ترجمہ کیا یہ اہلِ سنت اور ارباب تشیع کے مناقشات میں شرکت ہوئی، پھر ''القول المتین'' میں زمین کی حرکت و عدم حرکت کے قضیہ پر اپنا فیصلہ صادر کیا یہ گویا فلاسفۂ قدیم و جدید (۶) کے مباحثات میں مداخلت تھی، پھر ''کلمۃ الحق'' میں آداب مروجۂ بیعت کے ابطال کے درپے ہوئے، یہ دہلی کے دو متحارب و متخاصم گروہوں میں سے ایک گروہ (شہیدین و رفقاء) کی حمایت و نصرت کے مترادف تھا، پھر

راہ سنت میں ارباب بدعت کو للکارا اور یہ خانوادۂ ولی اللٰہی کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت کے خلاف نعرہ مبارزت تھا۔ اس کے بعد نمیقہ لکھ کر تصور شیخ کے جواز و عدم جواز کی بحث میں محاکمہ کیا، ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ کی طرف سے حکیم احسن اللہ خاں اور مرزا غالب، شاہان دہلی کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے تو سر سیّد نے بھی سلسلۃ الملوک کے نام سے ایک جدول شائع کردیا۔ یہ بھی دراصل نقطۂ نظر کے اختلاف کا مظاہرہ تھا۔ مرزا غالب کے برخلاف سر سیّد نے اس جدول میں ۱۸۰۳ء کے بعد سے سلاطین فرنگ کو متمکن کردیا تھا، پھر ولیم میور سے پھر ہنٹر سے پھر مخالفین اُردو سے، پھر بانیان کانگریس سے، مختصر یہ کہ ابتدا سے انتہا تک وہ واعظوں، بدعتیوں، شیعوں، ملاؤں، صوفیوں، فلسفیوں، ہندوؤں، عیسائی مبلغوں، فرنگی مصنفوں اور ملکی رہنماؤں میں سے کسی نہ کسی سے نبرد آزما رہے اور ظاہر ہے، کہ ان طبقات سے نمٹنے کے لئے اتنی متنوع صلاحیتوں اور متعدد فنون میں اس قدر دست گاہ کی ضرورت ہے کہ کسی ایک فرد میں ان کا اجتماع شواذ میں سے ہے اور اجتماع ہو بھی جائے تو کامیابی متیقن نہیں۔

سر سیّد کے یہاں یہی رنگ ہے!

دوسرا اہم اور غور طلب پہلو یہ ہے، کہ ان کی تقریباً اسی سالہ زندگی کے پہلے چالیس سال بڑی حد تک غیر سیاسی ہیں، اور ہم اس دور میں اجتماعی جدوجہد کے آثار ان کے کردار میں نہیں پاتے (۷) اور اس چالیس سال کی تقریباً نصف مدت ان کو کمپنی کی ملازمت میں گذر چکی تھی، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا پہلا سیاسی اقدام کمپنی کے حسن خدمت پر منتج ہوا یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اُنھوں نے مجاہدین حریت کا نہیں، کمپنی کا ساتھ دیا اور اس طرح اُنھوں نے نہ صرف کمپنی کے ایک ملازم کی حیثیت سے اپنے فرائض خدمت کی بجا آوری کی بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی زندگی کی پہلی سیاسی جدوجہد کی اور اس کے بعد اس راہ میں ان کے قدم رُکے نہیں بڑھتے ہی رہے اور اس سفر کے ثمرات سے بھی خوب خوب متمتع ہوتے رہے، ۱۸۵۷ء کی جاں فشانیوں، وفاداریوں اور خدمات کے صلے میں ایک ہزار کا قیمتی خلعت اور دو سو روپیہ ماہوار دو نسلوں تک وظیفہ پایا پھر سی، ایس، آئی سے ''معزز و ممتاز'' ہوئے پھر

کونسل کی رُکنیت سے مفتخر ہوئے پھر ''سی، ایس، آئی'' کا خطاب پایا، ڈاکٹر آف لاز'' کی ڈگری کے مستحق تصور کئے گئے پھر پبلک سروس کمیشن کی رُکنیت کا اعزاز پایا۔ یہ تمام اعزاز وخطابات ہمارے علم میں انیسویں صدی کے کسی ایک فرد کو نہیں ملے اور شاید انہی ثمرات وصلات کی زنجیر تھی، جس کی بدولت ہم انہیں زندگی بھر، بقیہ چالیس سال، اس راہ میں ثابت قدم و مستقل و مستقیم پاتے ہیں، ورنہ ان کی حیات کا جلی نہیں خفی عنوان ضرور عدم استقلال وعدم استقامت ہے۔

وہ بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو تبدیل فرمالیا کرتے تھے اور کوئی علمی و عملی کام وہ جم کر نہیں کر سکتے آغاز حیات میں ''ردروافض'' کی مہم میں حصہ لیا تھا مگر بعد میں اتنے ''روادار'' ہوگئے تھے کہ الفاروق کی تصنیف میں مولینا شبلی کے سدراہ ہوتے تھے، آثار کے باب چہارم میں شہیدین کی شان میں قصیدہ مدحیہ نشر کیا تھا، مگر ''تنبہ'' ہونے پر تلافی کیلئے اس پورے باب ہی کو حذف کردیا ۱۸۴۸ء میں حرکت زمین کے مسئلہ میں، قدماء طبیعین کے پلے میں اپنا پورا وزن ڈال دیا تھا مگر افکار میں ''تنور'' پیدا ہونے کے بعد اس کے برعکس عقیدہ کی تبلیغ کیا کرتے تھے، بیعت کے روا و نا روا طریقوں پر ایک زمانے میں گفتگو کی تھی مگر پھر سرے سے تصوف ہی کے منکر ہوگئے تھے ۱۸۵۹ء میں اُردو کی کم مائگی بلکہ تہی مائگی پر ایک مضمون میں داد استدلال دی تھی مگر ۱۸۶۷ء میں ورنیکلر یونیورسٹی کا نعرہ بلند کردیا۔

اِسی طرح ناقص و نامکمل علمی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے ایک زمانے میں کیمیائے سعادت کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی تھی مگر چند اوراق سے زیادہ ترجمہ کا سلسلہ دراز نہیں ہوا، ''وفادار مسلمانوں'' پر رسائل کی اشاعت کا آغاز کیا۔ مگر تین شماروں کے بعد یہ سلسلہ منقطع کردیا، تفسیر اناجیل کے لئے برگ وساز فراہم کئے کام بھی شروع کیا مگر ضروری کاموں کی طرف متوجہ ہوجانے کی وجہ سے یہ کام ادھورا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ''ہومیاپاتک'' (ہومیوپیتھی) نامی نظام علاج کا غلغلہ بلند ہوا تو چونکہ جدید تھا اور گل زمین دانش وحکمت سے IMPORT ہوا تھا لہٰذا اس کا اخذ وقبول اور اس کی اشاعت وابلاغ بھی مقتضائے ترقی پسندی اور دلیل تنور فکر ٹھہری چنانچہ ہومیاپاتک کے اصول وکلیات کی

ترویج و تبلیغ کا فرض بھی "بنام من دیوانہ زوند"۔۔ایک راجہ کو اس کی سرپرستی کیلئے آمادہ کیا ایک انجمن بنائی، ایک شفاخانہ کھولا، علاج شروع ہوا، اس کی رپورٹ شائع کی خود بھی ایک رسالہ تالیف کیا مگر ۱۸۶۷ء کی تقویم تبدیل ہونے کے بعد اس فن سے ان کے تعلق کا سراغ ۱۸۹۸ء تک نہیں ملتا، تہذیب الاخلاق تین بار جاری اور بند ہوا، تفسیر قرآن کا اختتام سفر حیات کے اختتام تک نہ ہو سکا، علم فلاحت پر کتابوں کا ایک سلسلہ مرتب کرنے کا ذمہ لیا تھا مگر اس ذمہ سے عہدہ برا نہ ہو سکے اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنی چاہی، آغاز بھی کر دیا تھا مگر انجام کو نہ پہنچا سکے۔

عملی کاموں میں بھی یہی حال مدت العمر رہا، تعلیم کا سلسلہ ایک بار موقوف کر دیا مگر پھر (اور وہ بھی کس شان سے) شروع کیا! طب کی طرف متوجہ ہوئے، افاضل اساتذہ کو چھوڑ کر صف آخر کے ایک حکیم صاحب (جن کی صرف یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک مشہور شاعر اور نام کے حکیم مومن خاں مومن کے عم مکرم تھے) سے صرف چند کتابیں پڑھی تھیں کہ نسخہ نویسی کرنے لگے۔ مگر تشخیص و تجویز کے غیر شاعرانہ فرائض سے معاملہ نہ ہو سکا پھر طب قدیم سے وابستگی و ہم دردی کا کوئی ثبوت بقیہ مدت حیات میں نہیں دیا، ورنیکلر یونیورسٹی کا نعرہ بلند کیا مگر نعرہ سے زیادہ بات نہ بڑھائی، "ایسوسی ایشن" کی ردیف میں کئی تنظیموں کو جنم دیا مگر ان میں سے اکثر کی عمر نے وفا نہیں کی کوئی "طفل مرگ" نکلی اور کوئی "جواں مرگ" ثابت ہوئی۔

غرض: اک طرفہ تماشا تھی سیّد کی طبیعت بھی!

سیّد مرحوم کے دامان حیات پر سب سے سوا بدنما اور "نادیدنی" داغ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شرکت حریفانہ تھی۔

جنگ آزادی بلا شک و ریب جنگ آزادی تھی، یہ فرنگی غاصبوں کی مستعمرانہ حرص و آز کے خلاف وطن دوست ہندیوں کی ایک حرکت تھی، بظاہر ناکام مگر نتائج و ثمرات کے پیش نظر کامیاب:۔ ہر وطن دوست طبقہ اور فرد نے اس جنگ میں حصہ لیا اور جس طبقہ اور فرد نے اس میں حصہ لینے میں کوتاہی کی اس کی غلامانہ ذہنیت دوں ہمتی، وطن دشمنی اور خدمت استعمار پر کوئی بڑے سے بڑا زبان آور اور

""قلم دراز"" بھی پردہ نہیں ڈال سکتا۔

اس جنگ میں ارباب ہند دو گرہوں میں بٹ گئے تھے، ایک طرف۔۔۔ہماری طرف۔۔۔ بخت خان، فیروز شاہ، فضل حق خیر آبادی، اور محمود خاں وغیرہم تھے، جب بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے، ہمارے دل دھڑک دھڑک کر ان کو سلامی دیتے ہیں۔

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پاؤں

دوسری طرف۔۔۔ہمارے مقابل۔۔۔ منشی رجب علی، الٰہی بخش اور سرسیّد وغیرہم تھے ان کے دامنوں پر فرنگیوں کی اعانت وحمایت ونصرت کا داغ ہے ان کے دامنوں کا یہ داغ ہمارے دلوں کا گھاؤ بن گیا ہے، ہم نے لاکھ حسن ظن کے مرہم استعمال کئے مگر یہ گھاؤ نہ بھرنا تھا نہ بھرا، یہی وجہ ہے کہ ہزار سعی احترام وادب کے باوصف جب ان حضرات کی زندگی کا یہ پہلو معرض کلام میں آجاتا ہے، کوئی کام ودہن میں تلخیاں گھول دیتا ہے۔

سرسیّد نے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اپنی سیاسی واجتماعی زندگی کا پہلا اقدام سن ستاون کی جنگ آزادی میں حریفانہ شرکت کی شکل میں کیا یعنی وہ اس معرکہ میں ہماری صفوں میں نہیں دشمن کی صفوں میں دیکھے گئے۔ ان کی ہمدردیاں اور وفاداریاں ملک واہل ملک کے ساتھ نہیں تھیں ""حکام انگریزی"" کے ساتھ تھیں اور دوسرں کا نہیں خود سرسیّد کا فخریہ بیان ہے کہ اس جنگ کو ناکام بنا دینے میں جن ملکیوں کی مساعی کو دخل تھا ان میں وہ بھی تھے۔

آخر اُنھوں نے ایسا کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب خود انہی کی زبان سے سنیئے اُنھوں نے بجنور میں مشہور مجاہد حریت نواب محمود خاں سے کہا تھا۔

""نواب صاحب! میں صرف تمھاری خیر خواہی سے کہتا
ہوں کہ تم اس ارادہ کو دل سے نکال دو، حکام انگریزی
کی عملداری کبھی نہیں جائے گی، اگر فرض کرو کہ تمام

ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو بھی حکام انگریزی

کے سوا کوئی عمل داری ہندستان میں نہ کر سکے گا“۔

ص ۳۵ سرکشی بجنور

سر سیّد کے اس قول سے ان کا یہ جزم و تیقن متبادر ہوتا ہے کہ

”اس معرکہ میں فتح ملکیوں کو نہیں غیر ملکیوں کو ہوگی“

آج برصغیر پاک و ہند کا ایک آزاد شہری سوچتا ہے اور بجا طور پر سوچتا ہے کہ:۔

آخر فتح و شکست کے سوال پر غور کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ غور کیا تھا تو وہ کن دلائل کی بنا پر اس فیصلہ پر پہنچے تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس فیصلہ کی بنا دلائل کے بجائے جذبات پر ہو! اس فیصلہ کے باوجود کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اُدھر کے بجائے اِدھر شریک ہوتے؟

سوالات بڑے معقول نظر آتے ہیں آیئے ان پر غور کریں۔

پہلا سوال ہے کہ آخر فتح و شکست کے انداز میں سوچنے کی کیا ضرورت تھی اور آیا اس طرح سوچنے کا کوئی موقعہ بھی تھا؟

افراد و اقوام کو بعض معرکے ایسے بھی پیش آتے ہیں جن میں فتح و ہزیمت کے سوال پر غور کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی، اس معرکہ میں بہر حال حصہ لینا ہوتا ہے، میدان میں بہر صورت کودپڑنے کی ضرورت ہوتی ہے اور حریف سے ٹکرا جانا ہی مقصود ہوتا ہے، فتح مندی مقصود و مطلوب نہیں ہوتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر فتح و ہزیمت کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر اُنھوں نے غور کیا ہی تھا تو آخر وہ کون کون سے دلائل ان کے ذہن میں آئے جن کی اساس پر اُنھوں نے فرنگی کی فتح کے پہلو کو ترجیح دی؟

اس کے جواب میں، ہمیں اپنے مطالعہ کی کمی اور نظر کی نارسائی کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے اور بے محابا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ان کے تقریباً تمام لٹریچر کی ”ورق نوردی“ کر ڈالی مگر کوئی مجمل یا مفصل برہان و دلیل اس خصوص میں دستیاب اور نظر فروز نہس ہوسکی۔

اور

اسی لئے تیسرے سوال کا جواب ہم پورے اعتماد کے ساتھ اثبات میں دیتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ سرسیّد کے اس فیصلہ کی پشت پر تفکر وتعقل قطعاً نہ تھا بلکہ یہ فیصلہ سرتاسر جذباتی تھا اسکی تشکیل میں خود ان کی اس خواہش کو دخل تھا کہ برصغیر کی زمام اقتدار ملکیوں کے ہاتھ سے نکل کر کمپنی کے ہاتھ میں چلی جائے، اس طرح اس فیصلہ کا منبع اُن کا دماغ نہیں دل تھا، ان کا دل یہ چاہتا تھا کہ ایسا ہونا چاہئے، اس لئے دماغ یہ سوچتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔

یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ سرسیّد نے خود اس کا اعتراف کیا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں تھا جس کا وہ اعتراف کرتے بلکہ یہ اُن کی نظر میں ایک قابل قدر کارنامہ تھا جس کا اُنھوں نے فخریہ اظہار کیا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اُنھوں نے لائل محمدنز کی اشاعت کا آغاز کیا تو اپنی ہی ذات گرامی کو اوّلین اہمیت دی، پہلے شمارے میں اپنی خدمات اور وفاداریوں کا ذکر بڑے طمطراق سے کرتے ہیں۔

> ۱۸۵۴ء میں جب میں نے ایک تاریخ دہلی کی پرانی اور اگلی عمارتوں کی لکھی تو اس میں سلسلہ سلطنت مغلیہ کا ۱۸۰۳ء سے یعنی جب سے لارڈ لیک سپہ سالار سلطنت انگلشیہ نے دہلی کو فتح کیا، منقطع کیا اور ہندوستان کی سلطنت میں سلسلہ (۸) شاہان انگلستان کا قائم کیا، اس سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس ہنگامے سے پہلے میری نیت یہی تھی کہ تمام اہل ہندستان جان لیں کہ اب سلطنت خاندان مغلیہ کی ختم ہوگئی اور ہندستان کی بادشاہت شاہان انگلستان کی ہے اس لئے تمام رعایا کو اپنے بادشاہ اور گورمنٹ انگلشیہ کی خیر خواہی اور

اس سے محبت پیدا کرنی چاہئے۔

''لائل محمڈنز اوف انڈیا'' مطبوعہ مفصلائٹ پریس آگرہ۔

یہ عبارت، کمپنی کے لئے سرسیّد کے خیر خواہ اور وفادارانہ جذبات کو کھول کر بیان کر رہی ہے کہ کس طرح وہ خواہش کو حقیقت سمجھ لینے کی نفسیاتی کمزوری کا شکار تھے، اسی میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ ان کا یہ خیال ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی تھا۔(۹)

اب دیکھنا یہ ہے، کہ یہ معرکہ جہاد جو مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا تھا اور اس طرح یکا یک ویک لخت شروع ہوا تھا کہ زیرک وچالاک فرنگی حکام کو بھی اس کی سن گن نہیں ملی تھی اس لئے اس کے عواقب ونتائج کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کی جاسکتی تھی وہ معرکہ بپا ہونے کے بعد ہی کی جاسکتی تھی، نہ کہ پہلے سے، وہ بھی ۱۸۵۲ء میں، چھ سال پہلے سے، اتنے پہلے جو رائے قائم کی گئی ہے ہو یقیناً حقائق و واقعات کی اساس پر مبنی نہیں ہوسکتی اور اسی لئے اس کو ''رائے'' نہیں کہا جاسکتا، رائے ہوتی ہے، فکر کا نتیجہ اور فکر کے لئے ترتیب مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں سرے سے مقدمات ہی کا وجود نہ ہو، صورت حالات ہی سامنے نہ ہو، فریقین کا تعین نہ ہو، ان کے عزائم و مقاصد، طرفین کی تعداد اور تیاریوں، کمان داروں کی صلاحیتوں اور تجربے، سپاہیوں کے احساسات کا علم نہ ہو۔ وہاں کسی قسم کی صحیح وغلط، معقول ونامعقول۔ رائے قائم نہیں کی جاسکتی، دماغ آخر سوچے گا تو کیا سوچے گا؟ ہاں! ۔۔۔ دل ان ہونی بات کی بھی چاہت کرسکتا ہے اور محالات کی تمنا پر بھی اس کیلئے کوئی قدغن نہیں ہے۔

رہا یہ کہنا کہ آپ اس بات کو سرسیّد کا نتیجہ فکر نہ مانیں اور مبنی بہ دلائل نہ تسلیم کریں خواہش و آرزو ہی کہہ لیں، بہرحال صحیح تو نکلی، پوری تو ہو کر رہی ۔۔۔ تو اصل میں کھلا مغالطہ ہے، حالات بدل جانے اور وقت گذر جانے کے بعد جب ہم ان حالات اور اس وقت میں کسی شخص کے افکار و کردار کا جائزہ لینے بیٹھیں گے تو صرف یوں نہیں کہ ''بے شک اُس نے جو رائے قائم کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی''۔ صحیح انداز فکر یہ ہے کہ اس کی تحقیق کریں کہ اُس وقت اور اُن حالات میں اس شخص کے دلائل کیا تھے؟ اور وہ کتنے محکم، قوی اور جان دار تھے؟ کیونکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے جو رائے قائم

کی ہو بے بنیاد ہو، جذبات پر مبنی ہو، اغراض پر مبنی ہو، خواہش پر مبنی ہو اور اس لئے اُس وقت ایک رائے کی حیثیت سے غلط ہو، مگر بعد میں حالات کے الٹ پھیر اور اتفاقات وغیرہ نے اس غلط رائے کو صحیح ثابت کر دکھایا ہو۔

اس انداز فکر میں ایک فائدہ یہ ہے کہ رونما ہونے والے نتائج تو رونما ہو کر رہے مگر اس شخص کی قوت فیصلہ کے متعلق ہم خود ایک فیصلہ کر سکتے ہیں۔

دو شخص آمادۂ پیکار ہوں، ایک تیسرا شخص نمودار ہو کر ان میں سے ایک کو خبردار کر دے کہ تو مغلوب ہوگا'' اور یہ کہہ کر وہ دوسرے کی اعانت کرنے لگے اور نتیجۃً جب پہلا مغلوب ہو جائے تو اپنی دانائی، پیش بینی اختر شناسی اور علم المغیبات کا سکہ جمانے چلے کہ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ تو مغلوب ہوگا آخر وہی ہوا۔''

آپ سوچیں تو بالکل یہ کردار سرسیّد کا تھا، معرکہ جہاد کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک اہم، ناقابل فراموش و درگذر سبب، ان ''وفاداران بریطانیہ'' کا وجود مسعود بھی ہے۔

اس مرحلہ پر بجا طور پر یہ خیال ہوتا ہے، کہ کاش! ایسا ہوتا کہ اس ''رائے'' کے باوجود سرسید اوران کے رفقاء کرام اس معرکہ میں فرنگیوں کے بجائے اہل ملک کی طرف سے شریک ہوتے مگر یہ خیال، خیال ہی نہیں محال و جنوں بھی ہے۔ ذہنی امراض میں سے ایک مرض (۱۰) اپنی رائے پر اصرار بھی ہے، سید مرحوم میں بھی یہ مرض تھا، وہ اپنی ہر رائے کو حتمی طور پر ظاہر کیا کرتے تھے، ان کا ہر قیاس عقیدہ بن جاتا تھا، ان کی ہر بات میں قطعیت (۱۱) ہوتی تھی اور ہر قول میں ادعا! اس لئے بھلا اس کا امکان کہاں تھا کہ وہ اختلاف رائے کو اکثریت کے فیصلہ کے آگے تج دیتے اور معرکہ میں اپنا بوجھ ملکیوں کے پلے میں ڈال دیتے، یہ باتیں صرف زندہ و بیدار اقوام و جماعات کے ساتھ مختص ہیں کہ ''فرد'' خود کو اجتماع میں گم کر دیتا ہے اور اپنی انفرادی رائے کو نظر انداز کر کے اجتماع فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور پورے خلوص و صداقت کے ساتھ، قومی یا جماعتی فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے برگ و برگ فراہم کرنے لگتا ہے تا آں کہ وہ تجویز، عمل کی کسوٹی سے دوچار ہونے کے بعد اپنے عیب و

صواب کو اجاگر کردیتی ہے اگر اکثریت کی منظور کردہ تجویز صائب وصحیح ثابت ہوتی ہے تو یہ فرد خوش ہوتا ہے کہ میری قوم یا جماعت نے صحیح فیصلہ کیا تھا (حالانکہ انفرادی طور پر یہ اس کی شکست ہوتی ہے) اور وہ تجویز صائب وصحیح ثابت نہیں ہوتی تو یہ رنجیدہ ہوتا ہے کہ ہماری مساعی لا حاصل رہیں (حالانکہ ذاتی طور پر یہ اس کی فتح ہوتی ہے۔)

اس کے برعکس ہمارے یہاں یہ عالم ہے کہ ''تصورات ونظریات'' کو ''عقائد'' کی طرح ذہن وفکر پر مستولی کرلیا اور ان عقائد کے لئے پوری قوم سے منقطع ہوکر اغیار کے حامی وناصر بن گئے، جب اغیار غالب ہوگئے تو شادیانے بجاتے ہوئے نہیں تھکتے، دیکھئے تو جو شخص اپنے کسی دعوے کے صحیح ہونے پر اتراتا ہے وہ دعویٰ اس کے افکار کا نہیں جذبات کا مظہر ہوتا ہے، سرسید ''لائل محمڈنز'' سیرت فریدیہ، اور اپنی اکثر تحریروں (۱۲) میں بار بار سقوط دہلی کو فتح دہلی سے تعبیر کرتے ہیں، گویا

جو فتح تیری ہے وہی میری شکست ہے

ہمارے لئے دہلی کا ہاتھ سے نکل جانا بہت بڑا حادثہ تھا

اس لئے ہماری تاریخ کا یہ ورق گل بوٹوں سے مزین نہیں کیا جاتا، اس حرکت قوی کی ناکامی ہماری تاریخ کا دل خوش کن، قابل فخر اور لائق مسرت واقعہ نہیں، دل خراش، اندوہ ناک، غم انگیز اور شائستہ ماتم وفریاد حادثہ ہے، ہم اس کو اپنی بدبختی اور محرومی قسمت تصور کرتے ہیں کہ ہماری یہ جدوجہد کامیاب نہ ہوسکی مگر ہم اس کو اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں فتح وشکست کا جو معیار اُنھوں نے بنایا ہے وہ ایجاد بندہ ہے نہایت گندہ ہے۔

سن ستاون کے معرکے میں اہل وطن ظاہر بین نگاہوں میں مغلوب ومفتوح ہوئے تھے، لیکن دیدۂ حقیقت نگاہ میں یہ غزاۃ وشہدا فوز وفلاح کے رتبہ بلند پر متمکن ہوگئے تھے۔

کام کی نکلیں مری ناکامیاں!

فرنگی ظالم وغاصب فتح مند نہیں ہوئے تھے بلکہ حکمرانی ومعدلت کی آزمائش میں ڈالے گئے تھے، وہ اس منصب پر متمکن ہوگئے تھے جس کے اہل نہیں تھے، چنانچہ اپنے جبر وتشدد کے ہاتھوں بہت

جلد بدنام اور معتوب و مغضوب ہو گئے اور ایک صدی بھی وہ ہماری دہلی پر قابض و متصرف نہ رہ سکے تھے کہ انھیں مراجعت پر مجبور ہونا پڑا۔

دیدی! کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب راسحر کند

سرسید ۱۸۹۸ء تک اس ''یقین'' میں ''مبتلا'' رہے کہ حکام انگریزی کی عمل داری ہندستان سے کبھی نہ جاسکے گی اور اسی یقین کی وجہ سے وہ فرنگی کی ہر جہتی خدمات مسلسل وعلی الاتصال انجام دیتے رہے حالانکہ برادران وطن نے انیسویں صدی کے اواخر میں ہی اپنے مطالبات (مخالفت اردو، انسداد ذبیحہ گاؤ وغیرہ) کی مہم شروع کردی تھی اور بیسویں صدی میں، سرسیّد کے انتقال کے سات سال بعد ہی تقسیم بنگال کیلئے اُنھوں نے نہایت پرزور اور موثر آئینی وغیر آئینی احتجاج کیا جس کے نتیجے میں حکومت کو اپنا اقدام ۱۹۱۱ء میں واپس لینا پڑا اس کے دو سال بعد ہی ۱۹۱۳ء میں سرسید کے برادران ملت نے مسجد کان پور کے سلسلے میں جو احتجاجی اقدامات کیے وہ کاروان جہاد آزادی کے لئے بانگ درا ثابت ہوئے اور پھر تو اس سامراج کے خلاف جو گونجتا گرجتا کاروان چلا ہے تو آزادی کی منزل مراد پر جا کر ہی ٹھہرا اور سرسید کی وفات کو پوری نصف صدی بھی نہ بیتی تھی کہ حکام انگریزی کی عمل داری سرزمین ہند کو داغِ مفارقت دے چکی تھی۔

الحاصل

سرسید انیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو اس صدی کے ۳/۴ حصے پر حاوی و محیط رہی اور جس نے اس عہد کے متعدد ''اشخاص'' کو ''شخصیات'' بنادیا۔ وہ ذاتی طور پر بہت سے محاسن و محامد اخلاق و سیرت کے حامل تھے۔ وہ ایک مصنف کی حیثیت سے بجا طور پر فراموش کردیئے گئے ہیں۔ اجتماعی مسائل میں اُنھوں نے ہماری خدمت نہیں بدخدمتی کی۔

خدا مجنوں کو بخشے مرگیا اور ہم کو مرنا ہے!

خواجہ فریدالدین

برعظیم پاک و ہند میں وہ حضرات جنہوں نے مغربی زبانوں اور علوم کی تحصیل کی تھی کئی گروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں، ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جنھوں نے سلاطین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے علوم والسنہ مغرب سے اعتنا کیا، دوسرا گروہ ان حضرات کا تھا جو دیسی درباروں (۱۳) کے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لئے سفر فرنگ پر مجبور ہوئے اور اس سفر نے ان کو وہاں کے علوم سے آشنا کیا، تیسرے گروہ نے خود اپنے شوق سیاحت کے طفیل یہ واقفیت حاصل کی۔ چوتھا گروہ جو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور پھیلتی ہوئی حدود کو دیکھ کر فرنگیوں سے انتفاع و تمتع کی خاطر ان کے علوم و ضاعات کی جانت مائل و راغب ہوئے اور نتیجۃً کارکنان کمپنی سے خوب خوب مستفیض ہوئے ہمارے نزدیک خواجہ فریدالدین احمد اس آخری گروہ میں محسوب ہیں۔

بریطانوی کمپنی کا دائرہ غصب و استحصال خواجہ فریدالدین کے عہد شباب (اٹھارویں صدی کے ربع آخر) میں بیش تر جنوبی ہند تک محدود تھا، اس لئے استغراب بھی اس وقت تک انہی اطراف میں محدود رہا، خواجہ فریدالدین احمد شمالی ہند کے ان گنتی کے لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے بدیسی علوم اور زبانوں کی تحصیل کی وہ جدید علم ہئیت سے بھی واقف تھے اور زبان انگریزی میں بھی انہیں شدوبد تھی۔

وہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے گویا یہ وہ دور ہے کہ مرکز میں محمد شاہ تخت سلطنت پر متمکن ہے، بنگال میں علی وردی خاں کی صوبے داری ہے۔ اودھ کے صوبے دار سعادت خاں مرکز سے اعلان بغاوت کر چکے ہیں، پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ ابھی ابھی ہوا ہے، علماء و صوفیا میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، میر غلام علی آزاد بلگرامی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالطیف بھٹائی، شاہ نیاز احمد بریلوی، شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی، شاہ غلام علی دھلوی اور شعراء میں، میر، سودا، درد، نظیر، میر حسن، حاتم، سچل سرمت، آتش وغیرہ کا دور ہے۔

خواجہ فریدالدین نے ایک کشمیری الاصل تاجر گھرانے میں آنکھ کھولی۔ان کے بزرگوں میں کئی پشتوں تک کسی اہل علم کا ذکر نہیں کیا گیا خود ان کے سات بھائیوں میں سے دو تو جوانی ہی میں چل بسے تھے، دو بھائیوں کو سرسید نے صوفی دور دیش کے حیثیت سے پیش کیا ہے۔ایک بھائی کمپنی کے ملازم تھے ایک بھائی سندھیا کی فوج میں سواروں میں تھے ایک بھائی قلعہٴ معلّٰی میں خدمت گار تھے اس گھرانے کو ہم صاحبِ ثروت مقتدر اور علمی گھرانا نہیں پاتے۔

خواجہ فریدالدین کی ابتدائی تعلیم، اساتذہ وغیرہ کے متعلق ہم قطعاً لاعلم ہیں، ہاں ۳۵ سال (۱۴) کی عمر میں علوم ریاضیہ کی تحصیل کے لئے وہ لکھنؤ گئے تھے اور تین سال وہاں رہ کر علامہ تفضّل حسین سے جدید ریاضیات کی تحصیل کی تھی۔

۱۷۷۹ء میں ۳۲ سال کی عمر میں ایک کشمیری گھرانے میں ہی شادی ہوئی، اولاد میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں اولاد میں باہم تین تین سال کا فصل رہا اور ۱۷۹۲ء میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور غالباً ان کی اہلیہ وفات پا گئیں۔

خواجہ فریدالدین پچاس سال کی عمر تک (تین سالہ سفر لکھنؤ چھوڑ کر) دہلی ہی میں رہے۔اس نصف صدی میں ان کے مشاغل و مصروفیات اور حالات و واقعات سے ہم لاعلم ہیں۔سرسیّد نے سیرت میں ان کی اب تک زندگی کو بالکل سپاٹ دکھایا ہے معاصر تاریخوں اور کتب تراجم میں بھی ہمیں ان کی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۷۹۷ء میں (پچاس سال کی عمر میں) وہ دوبارہ لکھنؤ کی طرف رُخ کرتے ہیں مگر اس سفر کے محرکات و مقاصد پردۂ خفا میں ہیں۔سرسیّد کا قلم بھی مہر بلب ہے اس لئے قیاس و تخمین سے اس خلا کو پُر کیا جاسکتا ہے وہ اس طرح کہ خواجہ فریدالدین نے دہلی کی زوال پذیر شاہنشاہی اور بے اثر و بے بصر شہنشاہ کی بے کسی کے حال و مستقبل کا جائزہ لیا ہوگا اور اپنی جولانیوں کے لئے اس میدان کو تنگ پایا ہوگا پھر شاہ عالم کی شاہی بھی وزارتوں کے اشارہائے چشم و ابرو پر چلتی تھی اور وزارتوں کے انقلابوں سے "نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد"۔ غازی الدین خاں کے بعد روہیلے، روہیلوں کے بعد مرہٹے،

مرہٹوں کے بعد پھر روہیلے، ان حالات میں اپنی نیاز مندیوں اور عقیدت کیشیوں اور خدمت کوشیوں کے لئے کسی ایک آستانے کا انتخاب اور کسی ایک گروہ سے کھلی کھلی وابستگی حصول مقاصد کے لئے بالعموم مانع وحارج ہوتی ہے، رہی ہر آستانہ سے یکساں عقیدت اور ہر گروہ سے بیک وقت وابستگی تو اس کے لئے فطانت ودراکی اور جرأت وبے باکی کی ذرازیادہ مقدار مطلوب ہوتی ہے۔

اس لئے ایسے حالات میں بالعموم حافظ شیرازی کا ایک شعر کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔

ما آزمودہ ایم دریں شہر بخت خویش

باید بروں کشید ازیں ورطہ رخت خویش

حافظ کا یہ شعر اور بہت سوں کے کانوں میں گونج چکا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے متعدد فنکار اور ہنرور احرام اودھ برسر نظر آتے ہیں۔ بہر حال خواجہ فرید الدین نے رختِ سفر لکھنؤ باندھا مگر ''کشش کاف کرم'' انھیں لکھنؤ سے پرے لئے جارہی تھی۔ چنانچہ سرسیّد کے بیان کے مطابق وہ اسی سال ۱۷۹۷ء میں لکھنؤ کے فرنگی حکام کی سفارش سے ملازم ہوکر کلکتہ چلے گئے۔

ان کے قیام کلکتہ کی مدت چھ سال ہے اس شش سالہ وابستگی داماں کی مدت میں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس انہماک اور تن دہی سے حکام والاشان صاحبان انگریز کی خدمت کا حق ادا کیا کہ کمپنی نے ایک اہم سفارتی مہم کے لئے ان کو منتخب کیا۔

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ زماں شاہ ابن تیمور شاہ ابنِ احمد شاہ ابدالی فتح ہند کا عزم رکھتا، کمپنی نے اس فتنہ کے سدباب کے لئے والیٔ ایران فتح علی شاہ قاچار سے مراسم پیدا کرکے ایک معاہدہ کرلیا یہ معاہدہ زماں شاہ کے لئے ابتداء میں دردسر بنا اور انتہا میں بلاء جاں ثابت ہوا اسی معاہدہ کے بعد کمپنی کی طرف سے نواب مہدعلی خاں حشمت جنگ سفیر بناکر ایران بھیجے گئے مگر وہ ناکام رہے اس لئے بلالئے گئے اور چند افراد پر مشتمل ایک سفارتی وفد بھیجا گیا اس وفد کے ایک رکن خواجہ فرید الدین بھی تھے، یہ وفد مستقل قیام کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ صرف ایک مسئلہ پر شاہ ایران کو آمادہ کرنا مقصود تھا، یہ پورا ہوگیا تو یہ وفد واپس آگیا۔

خواجہ فریدالدین کو مراجعت کلکتہ کے بعد ایک اور سیاسی وسفارتی مہم پر اوا (سلطنت گاہ برما) بھیجا گیا اور وہاں سے بھی وہ اپنے فرائض ومستحبات کو بحسن خوبی ادا کر کے لوٹے تو اندرون ملک ہی ان کو ایک خدمت کے لئے مامور کیا گیا یعنی علاقہ بنڈیل کھنڈ کے ایک ضلع (باندہ) کے ایک موضع (اوگاسی) میں مال گذاری وصول کرنے پر متعین کئے گئے اور کچھ دن تک اس منصب پر رہنے پائے تھے کہ وہاں ضلعی نظام کی شکل تبدیل ہوگئی۔ اس لئے خواجہ فریدالدین کنارہ کش (؟) ہو کر ۱۸۱۰ء میں دہلی واپس آگئے۔

وہ ۱۸۰۳ء میں ایران گئے تھے اور ۱۸۱۰ء میں دہلی واپس آگئے اس سات سال میں ایران، برما، بنڈیل کھنڈ میں قیام کے سنین کا تعین کرنے سے ہم معذور ہیں۔

بہر حال بارہ تیرہ سال بعد وہ دہلی واپس آئے اب دہلی کے زمین وآسمان بدل چکے تھے، وہ دہلی مرحوم ہو چکی تھی جس میں خواجہ فریدالدین پوری نصف صدی بے روزگار اور گم نامی میں بسر کر چکے تھے، ۱۸۱۰ء کی دہلی ''ان کی کمپنی'' کی ''مفتوحہ'' دہلی تھی اپنے لارڈ لیک کی دہلی تھی، جنرل آکٹرلونی کی دہلی تھی۔ مختصر یہ کہ اب ماحول بہت سازگار تھا اس لئے کہ اکبر شاہ ثانی کو کمپنی سے معاملہ کرنے کے لئے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو فرنگی حکام سے روابط رکھتا ہو اپنے داماد (سیّد محمد متقی خاں) کی سفارش پر اکبر شاہ ثانی نے خواجہ فریدالدین کو اپنا وزیر بنالیا اور ''دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ'' کا خطاب دیا۔

معاملہ یہ طے کرنا تھا کہ کمپنی شاہ کو مقررہ مجوزہ ماہانہ رقم پیش کرنے سے گریزاں تھی، رقم کی کمی سے شاہ کے آمد وصرف کا توازن بگڑ گیا تھا اس لئے وہ ایسی موثر وکالت کے خواہاں تھے کہ جو اصل رقم کو بحال کرادے، کلکتہ نشینوں سے خواجہ فریدالدین کی رسم وراہ کی بنا پر یہ توقع دلائی گئی کہ وہ یہ مہم سر کر سکیں گے۔ مگر انھوں نے وزیر ہو کر خلاف توقع آمد وصرف کے توازن کا ایک نرالا حل تجویز کیا، یعنی صرف کو اتنا گھٹایا کہ آمد کے متوازن ہو گیا نیز قلعہ معلّٰی کے ساز وسامان کو بھی فضول ٹھہرا کر فروخت کرنا شروع کر دیا اور رقم میں اضافہ کی مطلق سعی نہ کی۔

اس صورت حال سے قلعہ معلیٰ کے متوسلین میں اضطراب کی ایک لہر پیدا ہوگئی اور خود شاہ نے بھی اس انداز فکر و عمل کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا لامحالہ خواجہ فریدالدین کو کرسئ وزارت خالی کرنا پڑی اور وہ دہلی چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آمد و صرف کا وہ مصنوعی توازن پھر عدم توازن میں تبدیل ہوگیا اس لئے شاہ نے ایک مراسلہ تیار کیا جس میں اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے باعث رحم طلبانہ لب ولہجہ اختیار کیا اور اپنا حق ثابت کرنے کے بجائے وہی اخراجات کی کثرت کی شکایت کی گئی اور ''درخواست'' کی گئی کہ رقم میں اضافہ کر کے اس شکایت کا ازالہ کیا جائے، لیکن اس مراسلہ کی کلکتہ روانگی سے پہلے سیّد محمد متقی خاں نے شاہ سے کہا کہ خواجہ فریدالدین کلکتہ ہی میں ہیں وہ حکام رس ہیں ان سے پوچھا جائے گا تو اس مراسلہ کی صحت سے انکار کر دیں گے اور آپ کے سابق وزیر کی حیثیت سے گورنر جنرل کو بتا دیں گے کہ آمد و صرف کے عدم توازن کی بات غلط ہے۔ شاہ پر اس ''تقریر'' کا جادو چل گیا اور اس طرح دوبارہ ان کی وزارت کا اہتمام ہوگیا۔ خواجہ فریدالدین دہلی بلائے گئے اور ۱۸۱۹ء میں دوبارہ وزیر بنا دئے گئے۔ مگر

> ''اس دفعہ کے تقرر میں بھی نواب دبیرالدولہ نے درحقیقت ماہ واری پنشن کے اضافہ کی جو بنام پیشکش بادشاہ کے لئے مقرر تھی کوئی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ لیت ولعل کرتے رہے جس کے سبب بادشاہ کی کشیدگی بڑھتی گئی۔'' (سرسید، سیرت فریدیہ)

اور بالآخر انہیں دوبارہ وزارت سے دست کش ہونا پڑا مگر چلتے چلتے وہ ایک تجویز شاہ کو پیش کرتے گئے، تجویز یہ تھی کہ کوئی وکیل کلکتہ کے بجائے لندن بھیجا جائے اور اس منصب کے لئے رام موہن رائے کا نام بھی پیش کر دیا شاہ نے یہ تجویز قبول کر لی اور رام موہن رائے کو دہلی آنے کی دعوت بھی دے دی گئی۔ رام موہن رائے کی داستان آپ اصل کتاب اور حواشی میں پڑھیں گے۔

وزارت سے کنارہ کشی کے بعد راجہ رنجیت سنگھ والئی پنجاب کی طرف سے دعوت وزارت آئی

مگر ضعف قویٰ اور ''دو عملی'' (۱۴) کی مشکلات کے پیشِ نظر وہ یہ دعوت قبول نہ کر سکے اور گوشہ نشین ہی رہے زندگی کے آخری دو سال ان پر ''فکر معاد'' غالب رہی اور چونکہ مکا شاہ نامی ایک رسول شاہی فقیر کے مرید تھے۔ اس لئے چار ابرو کا صفایا بھی کروادیا۔

۱۸۲۸ء میں ستر اکہتر سال کی عمر پا کر رحلت فرما گئے۔

خواجہ فریدالدین کو علم ہئیت و ہندسہ سے بڑا شغف تھا وہ ان علوم کے قدیم و جدید دونوں مدارس فکر سے مستفید تھے، سرسید کا بیان ہے، کہ ان فنون میں انھوں نے متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ترتیب دیئے تھے مگر وہ سن ستاون کے ہنگامے میں ضائع ہو گئے، بہر حال تین رسالے ان کو پھر حاصل ہو گئے۔

ایک صنعت اصطرلاب کا۔

دوسرا صنعت پرکار متناسبہ کا۔

تیسرا اعمال پرکار متناسبہ کا۔

یہ تینوں رسالے فارسی زبان میں تھے ان میں سے پہلے رسالے کا اصل نام جیسا کہ سرسیّد نے بھی سیرت فریدیہ ہی میں دوسری جگہ اعتراف کیا ہے، تحفہ نعمانیہ تھا اور یہ خواجہ فریدالدین کی تصنیف نہیں ہے، خواجہ فریدالدین نے بھی اسے تحفہ نعمانیہ ہی کے نام سے کلکتہ میں ۱۸۱۵ء میں نقل کیا تھا مگر بعد میں اسے جوہرۂ فریدیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

۱۹۰۰ء میں خواجہ فریدالدین کے پڑپوتے خواجہ مصلح الدین احمد نے اس رسالے کو شائع کرتے وقت خود اقرار کیا ہے کہ ''زمان سابق میں ملا نعمان الدین اصطرلابی کے تلامذہ میں سے کسی نے ایک رسالہ لکھ کر تحفہ نعمانیہ نام رکھا تھا مگر اس دور میں عدم علم اور قصور طبائع کی وجہ سے وہ رسالہ گویا شریعت منسوخہ اور تقویم پارینہ کی طرح ناکارہ واز کار رفتہ ہو گیا تھا اس لئے بعض طلبہ کی درخواست پر خواجہ فریدالدین نے اس رسالہ کی تجدید بلکہ از سرِ نو تصنیف کی ہے۔''

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

(۱) باب اوّل در وضع صفحہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

(۲) باب دوم در وضع شبکہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ تین فصلوں پر مشتمل ہے۔

(۳) باب سوم در کیفیت ام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ تین فصلوں پر مشتمل ہے۔

(۴) خاتمہ در اعمال متفرقہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

مزید تفصیل و تعارف کی غرض سے مکمل سرورق کی نقل درج کی جاتی ہے۔

جوہرہ فریدیہ

تصنیف نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں مصلح جنگ وزیر اعظم سلطان ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی۔

خواجہ مصلح الدین احمد ابن نواب خواجہ شرف الدین احمد خاں ابن نواب دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین خاں بہادر مصلح جنگ ابن نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں مصلح جنگ نے مصلح المطابع واقع دہلی میں طبع کیا"۔

خاتمہ:۔

الحمد اللہ المنتہ کہ رسالہ نادرہ مسمیٰ بہ جوہرۂ فریدیہ در صنعت اسطرلاب (کذا) در مصلح المطابع دہلی بہ تصحیح تمام و تنقیح مالا کلام زیور طبع پوشیدہ نور افزاء نظر ناظرین گرویدہ ۱۳۱۵ھ ۱۹۰۰ء" صفحہ آخر۔

کل صفحات ۳۷ مختصر سائز قیمت ۲ر

اس رسالہ کا ایک نسخہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں ہے میں نے وہیں سے استفادہ کیا ہے۔

دوسرے رسالے کا نام "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" ہے سرسیّد نے ۱۸۴۶ء میں اس رسالہ کا فارسی سے اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

سیرت فریدیہ پر تبصرہ!

سرسیّد نے اس وقت قلم کاری کی ابتدا کردی تھی جب کہ ان کے شعور کا سبزہ آغاز تھا اور اس وقت تک قلم ان کی انگلیوں میں گردش کرتا رہا جب تک کہ ان کی کتاب حیات کا آخر ورق نہ الٹ گیا۔ چنانچہ وہ شذرات ومقالات کے علاوہ مستقل کتابوں کی بھی ایک معقول تعداد اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

سیرتِ فریدیہ سرسیّد کی مستقل تصانیف میں سب سے آخر تصنیف ہے۔ چھوٹے سائز کے ۵۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع مفید عام آگرہ میں ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

سرسیّد نے یہ کتاب جیسا کہ اسی کی ایک عبارت (ص ۳۲) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں لکھ ڈالی تھی تقریباً اسی زمانے میں مولینا حالی حیات جاوید کے لئے مواد فراہم کررہے تھے۔ جس میں ظاہر ہے کہ سرسیّد کے اسلاف کے حالات کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہو اور اُنہوں نے یہ مواد حالی ہی کے لئے فراہم کیا ہو۔ چنانچہ حالی نے لکھا بھی ہے کہ سرسیّد نے اپنے نانا کے حالات کے سلسلہ میں ایک یادداشت لکھوائی (حیات جاوید ص ۱۷) لیکن بیچ میں چونکہ حالی نے ارادہ ملتوی کردیا تھا اس لئے سرسیّد نے اس تحریر کو اپنے ہی نام سے شائع کرنے کا ارادہ کرلیا ہو۔

سطور ذیل میں سیرتِ فریدیہ کا ایک رواں جائزہ لینا مقصود ہے۔ زبان وادب کے نقطہ نظر سے بھی اور ایک ''حیات'' کی حیثیت سے بھی۔

سرسیّد جو سادہ اور آسان نثر لکھنے والوں کے پیش رو کی حیثیت سے شمار کئے جاتے ہیں ہم ان کی آخری تصنیف میں طویل طویل جملے پڑھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔

''اور تیسرا کام یہ کیا کہ دیوان عام کی چھت جس میں تانبے کی موٹی چادریں بطور چھت گیری لگا کر ان پر پیتل کی ڈنڈیوں و پھولوں سے جن پر سنہری ملمع تھا بطور خاتم بندی کے بنائی گئی تھیں اور جس کو بعہد شاہ عالم ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء کے بھاؤ مرہٹہ نے اکھاڑ ڈالا تھا اور لے جا نہ سکا تھا اور وہ سب اکھڑی پڑی

تھیں اور پھر اس کا بنانا بنظر حالات شاہی غیر ممکن تھا اس کا سونا اتروالیا گیا'' ص ۲۵

ایسا ہی ایک طویل جملہ ملاحظہ فرمایئے:۔

۔۔۔۔اُنھوں نے رام موہن رائے کو جو کلکتہ کے ایک بابو اور نہایت لائق اور ذی علم اور متین و بااخلاق تھے اور وہی برہمو سماج کے مذہب کے جواب بنگالیوں میں نہایت کثرت سے رائج ہے، بانی ہیں ، بلایا'' ص ۳۰

فعل اور اسم فاعل، مضاف الیہ میں فصل بعید کس قدر گراں گذرتا ہے۔

زبان کی غلطیاں بھی متعدد پائی جاتی ہیں:

پرلنگی کے لئے ''تہمت'' استعمال کیا ہے، اصل لفظ تہ بند ہے، جو بگڑ کر تہمد ہوگیا ہے، تہمت تو کرخنداروں کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

حلوے کے ٹکڑوں کو ''لوز'' (۱۵) کہتے ہیں اس کے جمع لوازت ہوئی، سرسیّد نے اس کی جمع الجمع ''لوزاتیں'' بنائی ہے، کیا دہلی میں اس طرح بولتے ہیں؟

پوری کتاب کا انداز بیان عامیانہ اور غیر فصیح ہے، سادگی ایک خوبی ضرور ہے مگر ایسی سادگی س سے عبارت بے رنگ، پھیکی اور پھُس پھُسی ہوجائے، محاسن میں نہیں معائب میں داخل ہے۔

''مرض موت میں مبتلا ہو کر مرے'' جیسے جملے بڑھ کر انسان کے لئے مسکراہٹ کو دبانا دوبھر وجاتا ہے۔

اس کتاب کے انداز بیان، زبان، ترتیب وغیرہ کو دیکھ کر ان آلام وافکار کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے جن میں سرسیّد آخری سنین حیات میں مبتلا رہے۔

جب ہم ایک ''حیات'' کی حیثیت سے اس کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جہاں تک اُردو کا تعلق ہے، اس سے پہلے متعدد کتابیں سیرت وسوانح کی لکھی جاچکی تھیں جن میں حیات

سعدی اور المامون وغیرہ خصوصیت سے اہمیت رکھتی ہیں اور سر سیّد تو حالی اور شبلی دونوں کے مرشد کہے جاتے ہیں مگر ان کی یہ کتاب ہر پہلو سے غیر معیاری ہے، یہ ایک ناقص و نامکمل سوانح ہے۔

فن سیرت نگاری و سوانح نویسی کی روشنی میں دیکھئے تو آپ اسے سر سیّد کیطرف منسوب کرتے ہوئے تکلف کریں گے۔

پہلے اس کے نقائص کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(۱) خواجہ فریدالدین کی تعلیم کا بیان اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے ۳۵ سال کی عمر میں ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے لکھنؤ جانے کا ذکر کر کے اس باب کو ختم کر دیا ہے، اس عمر تک اُنھوں نے کن کن علوم کی تحصیل کی؟ کن کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں، حالانکہ جس شخص کی سیرت کو ہم دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں ہمارا فرض ہے کہ یہ بھی بتائیں کہ اس نے اپنے وقت کے کن کن اساتذہ سے درس لیا تھا؟ کیا کیا کتابیں پڑھیں تھیں؟ کن کن فنون پر خصوصی توجہ تھی۔

(۲) اسی طرح صاحب سیرت کے احباب کا خانہ بالکل خالی ہے، کسی شخص کے افکار و کردار کے جائزہ میں اس کے روابط و مراسم سے بڑی مدد ملتی ہے اس کے حلقۂ احباب اور دائرہ تعارف سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ کس معیار کا آدمی تھا؟ معاشرہ میں اس کا کیا مقام تھا؟ کس قسم کے افراد میں اس کی آمد و رفت اور نشست و برخاست تھی؟

(۳) صاحب سوانح کے علمی مقام و مرتبہ کے متعلق کتاب میں ایک حرف نہیں ملتا، یہ کمی بڑی نمایاں ہے، کسی شخص کے سنین ولادت و وفات کا تعین یوں تو بہت خوب ہے مگر بات اسی وقت بنتی ہے جب بتایا جائے کہ ان ان تاریخوں میں آنے جانے والے کی یہ حیثیت تھی، اپنے عہد کے علماء میں اس کا یہ مقام تھا۔ فلاں فلاں فنون میں اس کو فضل و کمال حاصل تھا، فلاں فن میں اس کے مخصوصات و مجتہدات یہ اور یہ ہیں، اس نے جو رسالہ تالیف کیا تھا اس میں فن کے فلاں مبحث پر گفتگو کی تھی۔ متقدمین و معاصرین میں سے فلاں اور فلاں سے تعارض کیا تھا اور اس شان سے کیا تھا، اتنی باتیں نئی کہی

تھیں اور پھر کوئی انوکھا دعویٰ، کوئی نئی دلیل کوئی کامیاب مثال کوئی جدید تحقیق (اگر ہو تو) مثال میں پیش کی جائے، اس کے معاصرین و متاخرین نے اس کے نظریات کے ساتھ جس طرح بھی تائیداً و تردیداً اعتنا کیا ہو اس کے اقتباسات دیئے جائیں اس کے بعد کہا جائے کہ یہ تھی وہ خصوصیت جس کی بنا پر ہم نے اس شخص کو اس عہد کی ایک شخصیت قرار دیا ہے اور سیرت نگاری کے لئے اس کا انتخاب کیا ہے، اب اس کے سنین ولادت و وفات کی اہمیت قاری کو محسوس ہوگی اور اسے جستجو ہوگی کہ وہ عالم کس طرح زندگی گذارتا تھا اور یہ معلوم کرنے کی دلچسپی ہوگی کہ وہ کیوں کر جیا اور کیوں کر مرا

سرسیّد نے سیرت نویسی کے اس اہم فریضہ کو نظر انداز کر کے نہ صرف خواجہ فریدالدین کی ذات کو بلکہ سیرت فریدیہ کو بھی غیر اہم بنا دیا ہے۔

(۴) خواجہ فریدالدین کی اہلیہ کے تذکرہ سے دامن بچانے کا خصوصی اہتمام اس کتاب میں پایا جاتا ہے، ابتدا میں یہ بتا کر وہ خواجہ محمد مراد کی لڑکی تھیں، چپ سادھ لی ہے حتٰی کہ ان کی وفات تک ذکر نہیں کیا وہ ایک رفیقۂ حیات کی حیثیت سے کیسی تھیں، اُنھوں نے کس منزل عمر تک شوہر کی رفاقت کی؟ اولاد کی تربیت میں ان کو بھی شرکت کا موقع ملا تھا یا اس وقت سے پہلے ہی چل بسی تھیں؟ یہ سوالات ہیں جو بار بار سامنے آتے ہیں مگر سیرت فریدیہ مہر بلب ہے، کسی شخصیت کے سوانح حیات پڑھتے وقت فطرتاً یہ کرید ہوتی ہے کہ وہ اپنی جیون ساتھی کے باب میں خوش نصیب تھا؟ یا بدنصیب؟ وہ کس قسم کا شوہر تھا؟ بیوی نے کس عمر تک اس کا ساتھ دیا؟ بیوی کی رفاقت میں اس کے سیاسی و عملی کاموں کا کیسا رنگ تھا؟ اور بیوی کی جدائی نے اس کے دل و دماغ کو کتنا متاثر کیا تھا؟ اور ان تاثرات نے اس کی خانگی اور شہری زندگی اس کے زبان و قلم اور فکر و نظر میں کیا انقلاب پیدا کیا؟۔۔۔۔ ان جیسے بہت سے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور۔

واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں!

(۵) خواجہ فریدالدین کی اولاد میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں بتائی ہیں:۔

بڑے بیٹے خواجہ وحیدالدین احمد کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ جنرل داؤد اختر (ڈیوڈ آکٹر) لونی

کے ایک مدت تک مصاحب خاص رہے تھے، پھران کی اولاد کا کوئی ذکر نہیں اگر وہ لاولد نہیں مرے تھے تو ۱۸۹۶ء تک ان کے پوتے پوتیاں بھی جوان ہوں گی جیسے کہ ان کی بہن (والدۂ سر سیّد کے پوتے (سیّد محمود) صاحبِ اولاد ہو چکے تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ سر سیّد کے تعلقات اپنے ننھیال سے خوشگوار نہیں تھے۔ سیرت فریدیہ کے ناقص ہونے کی بھی اصل وجہ یہی تھی کہ اس کی تالیف میں ننھیال کی کوئی اعانت و شرکت نہیں تھی، اور اس میں کسی خانگی دست آویز اور تحریر کا حوالہ اور ذکر نہیں ملتا۔ حد یہ کہ خواجہ فریدالدین کی تصانیف ان کو خلیفہ محمد حسین کے ذریعہ دستیاب ہوئیں۔ حالانکہ وہ ان کے ننھیال میں موجود تھیں اور سر سیّد کی وفات کے فوراً بعد اُنھوں نے ''جوہرۂ فریدیہ'' شائع کی۔

اسی طرح دوسرے بیٹے خواجہ زین العابدین کے صرف ایک بیٹے خواجہ ہاشم علی کا صرف نام (وہ بھی ایک دوسرے موقع پر) آ گیا ہے، حالانکہ ان کے دو اور بیٹے بھی تھے۔

بیٹیوں کے ساتھ تو اور بھی طرفہ معاملہ لیا، بیٹیوں کی تعداد تین بتائی اور ان کے نام بھی گنوا دیئے مگر ان میں سے دو کو یکسر نظر انداز کر ڈالا، صرف ایک بیٹی کا ذکر خیر کیا اور ایسے والہانہ انداز سے کیا کہ توازن و تناسب کی بھی فکر نہ رہی۔ ۷۵ صفحات کی اس کتاب میں ۱۳ صفحے ان کے لئے وقف کر دیئے۔ ان کی اولاد میں سے بھی اپنے اور اپنی اولاد کے ذکر کو طول دیا ہے اور ایک مقام پر تو ایسی سادہ دلی اور معصومیت کے ساتھ اپنا ذکر کیا ہے کہ ہنسی آتی ہے، اپنی والدۂ ماجدہ کے فضائل و محامد و مناقب تفصیل و وضاحت سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

''اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق دانش مند اور دور اندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں ، اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اس نے تربیت

کی ہو کیا اثر پڑتا ہے؟"

ان نقائص کے علاوہ بعض اغلاط بھی بطور خاص قابل ذکر ہیں:۔

(۱) خواجہ فریدالدین کے لئے لکھا ہے کہ وہ مدرسۂ کلکتہ کے سپرنٹنڈنٹ بمشاہرۂ سات سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے۔۔۔اور حقیقت یہ ہے کہ مدرسۂ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ کا کوئی عہدہ ہی نہیں تھا، خواجہ فریدالدین سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ کسی اور عہدہ پر بھی نہیں رہے پھر مدرسۂ کلکتہ میں کسی بھی منصب کا اتنا کثیر وخطیر معاوضہ اس دور میں نہیں تھا۔

(۲) اکبر شاہ ثانی کی طرف راجہ رام موہن رائے کے بطور سفیر انتخاب وتقرر کو راجہ سکھ رائے وغیرہ کی طرف منسوب کیا ہے مگر شاہ نے جو خط راجہ کو کلکتہ سے بلانے کیلئے لکھا تھا وہ یہ راز افشا کرتا ہے کہ یہ منصوبہ اور یہ انتخاب خواجہ فریدالدین کے تھے۔ لطف یہ ہے کہ اس انتخاب کو دوسروں کے سر تھوپ کر انھوں نے نادانی کا کام بتایا ہے، بے شک یہ نادانی تھی، مگر یہ نادانی خواجہ فریدالدین نے کی تھی۔

(۳) شاہان دہلی کے لئے انگریز کی طرف سے ماہانہ رقم کے سلسلے میں جانبداری اور تادیل تراشی کی ایک مضحک اور ناکام کوشش کی ہے مضحک یوں کہ حمایت فرنگ کا جو ولولہ اور ہیجان ان میں ۱۸۵۷ء اور اس کے فوراً بعد تھا، ۱۸۹۶ء تک وہ علی حالہا قائم وباقی بلکہ نمو پزیر نظر آتا ہے ناکام یوں کہ حقیقت کا منھ چاہے کوئی کتنی ہی فنکاری سے چڑائے حقیقت، حقیقت ہی رہتی ہے، فرنگی نے ۱۷۶۵ء سے ۱۸۵۷ء تک مغل فرماں رواؤں سے بدعہدیاں کیں اور اس کثرت سے کیں۔

کہ جن کو گنتے گنتے دُکھ گئی ہیں انگلیاں میری

اگر کوئی مظلوم کے بجائے ظالم کی حمایت کرتا ہے تو وہ ناکام ہے اس کی ہر سعی ناکام ہے۔

(۴) ایک غلطی جسے کتابت کی غلطی بھی کہا جاسکتا ہے علامہ تفضّل حسینؔ خاں کی تاریخ وفات کے سلسلے میں کی ہے ان کی تاریخ وفات ۱۱۱۵ء مطابق ۱۷۹۹ء لکھی ہے، صحیح ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء ہے۔

مختصر یہ کہ سیرت فریدیہ زبان وادب کے نقطہ نظر سے ایک غیر معیاری کتاب ہے اور فنی اعتبار سے مجموعۂ اغلاط ونقائص!

آخر میں ہم اس اعلان کو نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو سرورق کے چوتھے صفحہ پر درج تھا اور علی گڑھ کالج سے سر سیّد کے تعلق خاطر کو ظاہر کرتا ہے۔

اگر چہ یہ کتاب قلیل الاجزاء ہے مگر اس کی قیمت ایک روپیہ قرار پائی ہے اس لئے کہ جس قدر کتابیں فروخت ہوں گی ان کی قیمت مدرستہ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ کو دی جاوے گی پس خریدار کو گراں نہ سمجھیں گے بلکہ یہ کہیں گے۔

سفال چند دادم جاں خریدم
تعالےٰ اللہ عجب ارزاں خریدم

سیرۃ فریدیہ

یعنی

حالات زندگی

نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ

وزیر

ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

مؤلفہ

ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں بہادر ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی

موروثی خطاب شاہی

جوادالدولہ سیّد احمد خاں بہادر عارف جنگ

سیرت فریدیہ

حالات زندگی نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ وزیر اکبر شاہ ثانی

خواجہ فریدالدین احمد خاں جن کو اکبر شاہ ثانی کے عہد ثانی میں عہدۂ وزارت اور مذکورۂ بالا خطاب ملا تھا۔ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی (ان کے مفصّل حالات ضمیمہ شخصیات میں ملاحظ ہوں) کی اولاد میں ہیں۔ جن کا مزار مرو میں ہے اور شاہ ہمدان کے لقب سے مشہور ہیں۔

ہمدان عراق عجم مملکت ایران کا ایک شہر، طہران سے ایک سو ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ شہر نہایت آباد اور تجارت گاہ تھا۔ تیمور نے اُس کو تباہ کر دیا۔ معجم البلدان میں اس کا عرض بلد ۳۶ درجہ اور طول بلد مغرب سے ۷۳ درجہ لکھا ہے۔ انگریزی مہندسوں نے اس کا عرض بلد ۳۴ درجہ ۵۰ دقیقہ اور طول شرقی گرینچ سے ۴۸ درجہ ۳۲ دقیقہ قرار دیا ہے۔

خواجہ یوسف ہمدانی

خواجہ یوسف ابن ایوب ابن الہمدانی اولیائے کبار میں تھے ان کا لقب ابو یعقوب ہے۔ وہ ۴۴۰ھ ہجری مطابق ۱۰۴۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰ء میں بہ مقام یامن جو مرو کے راستے پر ہے انتقال کیا۔ اوّل اُن کے جنازہ کو وہیں دفن کر دیا اور پھر مرو میں لے جا کر اس مقبرہ میں جو اُن کے نام سے مشہور ہے، دفن کیا۔ پچانوے برس کی عمر ہوئی بغداد میں اُنھوں نے تعلیم پائی اور ابو اسحاق فقیہ سے علم فقہ پڑھا۔ ان کا مذہب حنفی تھا اور شیخ عبداللہ جوینی کے مرید تھے اور اُن ہی سے خرقۂ خلافت پایا تھا عراق عجم، خوارزم، خراسان، ماوراء النہر میں اُن کی کمال شہرت تھی۔ مرو میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ عبداللہ برتی۔ خواجہ حسین انداقی۔ خواجہ احمد بسوی۔ خواجہ عبدالخالق غجدانی ان کے خلفائے کبار میں سے ہیں (تاریخ یافعی۔ نفحات الانس جامی۔ سفینۃ الاولیا۔ انوار العارفین۔ طبقات الکبریٰ عبدالوہاب شعرانی)۔

خواجہ یوسف کی اولاد کشمیر میں

اُن کے انتقال کے بعد اُن کی اولاد مرو سے کشمیر میں جا بسی تھی۔ کشمیر میں اور ملکوں سے بھی مسلمان آ کر آباد ہوئے۔ مگر وہ کشمیری الاصل نہیں ہیں بلکہ نزیل کشمیر ہیں۔ کشمیری الاصل وہی ہیں جو وہاں کے اصل باشندے تھے اور مسلمان ہو گئے ہیں۔

کشمیر کے اصل باشندے اپنے گوت کا ایک لقب رکھتے ہیں اور اس کو ال کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی کشمیری پنڈت کہلاتے ہیں اپنے نام کے ساتھ اپنا ال لگاتے ہیں۔ ان میں سے جو مسلمان ہو گئے ہیں وہ بھی نسل در نسل اپنی ال کو یاد رکھتے ہیں اور گویا وہ نشانی ان کے کشمیری الاصل ہونے کی ہے۔ جو نزیل مسلمان مدت دراز سے کشمیر میں رہنے لگے ہیں اور وہاں اُن کی پشتیں گذر گئیں وہ بھی کشمیری کہلاتے ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ کوئی ال جو کشمیری الاصل ہونے کی علامت ہے نہیں ہوتا۔ خواجہ یوسف ہمدانی کی اولاد اور خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد جو کشمیر میں آباد ہو گئی دراصل اونھیں کا لقب

خواجہ تھا۔ مگر ہندستان میں بہت سے مسلمان کشمیریوں نے بھی جو کشمیر الاصل ہیں یہ لقب اختیار کر لیا ہے۔

ولادت و خاندان

خواجہ فرید الدین احمد ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ اشرف تھا۔ ان کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بطریق تجارت دلی میں آئے تھے۔ اور کشمیری مال کی تجارت کرتے تھے اور ریشم کی تجارت کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ آخر کو انھوں نے دلی ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا۔

خواجہ فرید کے سات بھائی

خواجہ اشرف کے آٹھ بیٹے تھے۔ خواجہ فرید الدین۔ خواجہ علاؤ الدین۔ خواجہ شہاب الدین۔ خواجہ نور الدین۔ خواجہ نجیب الدین۔ خواجہ حسام الدین۔ خواجہ کمال الدین۔ ان میں سے جو سب سے بڑے نامی ہوئے اور جن کو ہزاروں آدمیوں نے سجدہ کیا اور معبود اللہ کہا وہ خواجہ نجیب الدین تھے۔ وہ ابتدائی عمر سے رسول شاہی فقیر ہو گئے تھے جو سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ جی (دیکھئے ضمیمہ شخصیات) کے پیرووں کا پیدا ہو گیا تھا اور مولوی محمد حنیف (دیکھئے ضمیمہ شخصیات) جو رسول شاہ جی کے جانشین تھے۔ خواجہ نجیب الدین اُن کے چیلے ہو گئے تھے اور ان کے پیر نے فدا حسین (۱) ان کا نام رکھ دیا تھا۔ شاہ فدا حسین نے تمام علمی کتابیں اپنے پیر سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو اپنے مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں۔ اُن کا مشرب اور عمل وحدت وجود پر تھا اور وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی مونچھ کا صفایا۔ ایک لنگوٹی باندھے۔ اور سارے بدن پر کوئلے کی راکھ ملے ہوئے جو بھبوت کہلاتی تھی بیٹھے رہتے تھے۔ اگر حجرہ سے باہر نکلتے تو ایک تہمت (۲) گھٹنوں تک لپیٹ لیتے تھے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ اُنھوں نے اٹھارھویں محرّم روز پنج شنبہ 1259ھ ہجری مطابق

۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ اُن کا مزار الور میں رسول شاہیوں کے تکیہ میں ہے جو چمیلی باغ کہلاتا ہے۔شاہ فدا حسین بہت مستعد عالم تھے اور کبھی کبھی کسی کو فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات حضرت محی الدین ابن عربی اور دیگر اہل وحدت وجود کی نہایت عمدگی اور خوبی سے پڑھاتے تھے۔

خواجہ علاء الدین صاحب (مزید حالات شخصیات میں ملاحظ ہوں) نے بھی مثل بزرگانِ دین کے درویشی اختیار کی تھی اور طریقۂ علیا نقشبندیہ میں شاہ محمد آفاق صاحب (مزید حالات شخصیات میں ملاحظ ہوں) کے مرید اور خلیفہ تھے اور حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ ادا کی تھی۔ اگرچہ اُنھوں نے تاہل کیا تھا مگر تمام عمر گوشہ نشینی اور ذکر وافکار و زہد و مجاہدہ میں گذرانی اور ۲۰/ جمادی اوّل روز یک شنبہ ۱۲۷۴ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء کے انھوں نے انتقال کیا۔اُن کے تین بیٹے تھے۔خواجہ ضیاء الدین صاحب جو ایک مشہور واعظ تھے اور خواجہ کمال الدین صاحب ان دونوں نے انتقال کیا مگر ان کے بڑے بیٹے حکیم خواجہ بہاء الدین صاحب جاورہ میں موجود اور اس وقت تک زندہ ہیں۔

خواجہ حسام الدین نے اپنی جوانی میں دریائے چنبل میں ڈوب کر اور خواجہ کمال الدین نے عالم شباب میں مَرضِ موت میں مبتلا ہو کر انتقال کیا تھا۔خواجہ شہاب الدین عربی نسخ خط لکھنے کے اُستاد تھے اور انگریزی عمل داری میں کسی محکمہ میں ناظر ہو گئے تھے۔خواجہ محی الدین کو سرکار بادشاہی میں تعلق ہو گیا تھا اور خواصان شاہی کے سرچوکی ہو گئے تھے۔خواجہ نور الدین کو چند روز تک دربار سیندھیہ میں فوج سواروں میں کوئی عہدہ افسری کا مِل گیا تھا۔

خواجہ فرید لکھنؤ میں

مگر خواجہ فرید الدین احمد بہت زیادہ اقبال مند ہونے والے تھے۔ ان کو ابتدائے عمر سے تحصیل علم کا بہت شوق تھا اور علوم ریاضیہ سے ان کو طبعی مناسبت تھی وہ علم کی تحصیل کی طرف متوجہ تھے۔ دلی میں انھوں نے درسی کتابوں کو تمام کیا۔ دلی میں کوئی شخص علوم ریاضیہ (۳) میں زیادہ مشہور نہ تھا۔

علامہ تفضّل حسین خاں

مگر علامہ تفضّل حسین خاں لکھنوی (دیکھئے ضمیمہ شخصیات) تمام علوم میں اور خصوصاً علوم ریاضیہ میں نہایت مشہور تھے اور لوگوں نے علامہ کا لقب ان کو دیا تھا۔ خواجہ فرید الدین احمد علوم ریاضیہ کی تحصیل اور تکمیل کے لئے لکھنؤ گئے اور انتہا درجہ تحصیل کی جو کتابیں علوم ریاضیہ کی ہیں اُن سے پڑھیں اور دو تین سال وہاں رہ کر دلی واپس آئے۔

یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ کیونکہ نواب آصف الدولہ ۲۵ رذی قعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء کے مسند نشین ہوئے تھے اور ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء کے اُنھوں نے لکھنؤ کو دارالریاست قرار دے لیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۷۹۷ء کے ہوا۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ۳ رشعبان ۱۲۱۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۷۹۸ء نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے۔

علامہ تفضّل حسین خاں پہلے جنرل پامر کے پاس منشی تھے۔ پھر ان کی سفارش سے نواب آصف الدولہ نے اُن کو اپنا سفیر کر کے کلکتہ بھیجا تھا اور جب وہ لکھنؤ میں آئے تو عہدۂ نیابت بھی ان کو مل گیا تھا۔ نواب سعادت علی خاں ک عہد میں علامہ تفضّل حسین خاں دوبارہ عہدہ سفارت کے امیدوار ہو کر کلکتہ گئے مگر نواب سعادت علی خاں نے سند سفارت ان کے پاس بھیجی۔ اس لئے وہ کلکتہ سے واپس ہوئے اور اثنائے راہ میں بہ مقام ہزاری باغ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۷۹۹ء (۴) کے اُنھوں نے انتقال کیا۔

خواجہ فرید کی شادی

دلی میں ایک اور کشمیری خاندان خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد میں کشمیر سے آ کر آباد ہوا تھا۔ خواجہ فرید الدین احمد کی شادی غالباً ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں خواجہ محمد مراد احراری کی بیٹی سے ہوئی۔ پادشاہان دلی کے عہد میں چار معزز عہدے تھے۔ ایک ملک العلماء کا جس قدر علما پادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اور ان کو جو انعام و اکرام یا جاگیر و منصب ملتا تھا وہ سب ملک العلماء کے ذریعہ

سے ملتا تھا۔ دوسرا ملک الحکما کا جو شخص یہ عہدہ رکھتا تھا اسی کے ذریعہ سے تمام طبیب دربار شاہی میں پیش ہوتے تھے۔ تیسرا ملک الشعراء کا۔ اس عہدہ دار کے ذریعہ سے تمام شعراء پادشاہ کے دربار میں حاضر ہو سکتے تھے۔ چوتھا ایک عہدہ تھا جس کی وساطت سے درویش اور مشائخ پادشاہ کے پاس جا سکتے تھے اور وظائف اور ادرار اسی کے ذریعہ سے ان کو دیئے جاتے تھے۔ اور تمام درگاہوں کا سالانہ خرچ اور درگاہوں کے عرس اور فاتحہ وغیرہ کے اخراجات اُسی کے ذریعہ سے ہوتے تھے۔ اس عہدہ کا نام ملک الاولیا تو نہیں قرار پا سکتا تھا اس لئے اس عہدہ کا نام نقیب الاولیاء قرار دیا گیا تھا۔ خواجہ محمد مراد احراری اسی عہدہ پر مامور تھے جو ایک نہایت بزرگ اور عالی رتبہ تھے۔ خواجہ فریدالدین احمد کی ایک ہی بیوی تھیں اور اُن سے پانچ اولادیں پیدا ہوئی تھیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ اور یہ اولادیں تین۔ تین برس کے فاصلہ سے غالباً ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء کے پیدا ہو چکی تھیں۔

پھر لکھنؤ کی طرف

۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء کے خواجہ فریدالدین احمد پھر لکھنؤ گئے۔ یہ زمانہ بھی نواب آصف الدولہ کا تھا۔ مگر چند روز بعد ہی نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے۔ اس دفعہ کے سفر لکھنؤ میں جو نہایت دلچسپ امر پیش آیا۔ وہ خود خواجہ فریدالدین احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے رسالہ (۵) مسمّٰے ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' کے دیباچہ میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جس کو ہم بعینہ نقل کرتے ہیں۔

فوائد الافکار کا دیباچہ

وہ لکھتے ہیں کہ ''چنین گوید مؤلف ایں رسالہ فریدالدین احمد کہ چوں فقیر را از ایام طفولیت شوق بود بہ علم ریاضی و درحال تحصیل چیزی ازیں نمودہ و اکثر بمطالعہ کتب ریاضی می پرداخت در بعضے حواشی بہ نظر آمدہ کہ پرکار متناسبہ از جملہ آلات ریاضی بود کہ ازاں اکثر اعمال نجومی و بعضے اشکال ہندسی

ومسائل حسابی بآسانی استخراج می شد حالا علم وعمل آں بہ سبب نایابی آن آلہ مفقود است ونیز زبانی بعضے اوستادان خود ہمیں شنیدہ بودم پس ازاں اشتیاق آں بدل داشتم واز ہر کس ریاضی داں کہ تذکرہ آن می کردم می گفت کہ ماندیدہ ایم وشنیدہ ایم اغلط باشد پرکار ہمیں است کہ برائے رسم دائرہ وپیمائش خطوط بکار می آید۔ دیگر قسم پرکار نیست۔ بعد آں کہ در ۱۲۱۲ھ ایں فقیر در لکھنؤ وارد شدہ واز جنرل مارٹین ومسٹر گوراوزلی کہ حکیم مشرب بود ملاقات شدہ تر واوشاں یک آلہ عجیب وغریب دیدم از برنج وآہن مرکب ودوپرّہ نوک دار برہم نہادہ ودر کمر آں میخ مثل مقراض بند کردہ مگر میخ ایں آلہ از جائے خود حرکت می کردتا آں راازجا حرکت دادہ دور ونزدیک از سر آن بدارند بر ہر دو سطح آں خطوط چند بود چون گاہے ایں قسم چیز نہ دیدہ بودم استفسار کردم گفتند کہ نام ایں وزبانِ انگریزی بمعنی پرکار تقسیم است واز یں آلہ تقسیم خطوط ودوائر وسطوح واجسام مختلفہ بہ آسانی می شود چون آن آلہ از جنرل مارٹین بود از اوشان عاریت گرفتم و دانستم کہ پرکار متناسبہ ہمیں باشد چوں ہر چہار عمل کہ دراں موضوع بود مسٹراوزلی روبروئے من کردہ بود مکان خود آوردہ اعمال آن کردم و بسیار فکر کردم کہ چیزے از اعمال نجومی ازاستخراج شود ہیچ نہ شد دانستم کہ ایں پرکار متناسبہ نیست مگر چند روز محنت کردہ بدلائل اصول طور صنعت آں مستنبط کردم ومانند آں یک پرکار نقرہ تیار کردم مسٹراوزلی ازمن گرفتہ بہ نواب وزیر سعادت علی خاں بہادر گزرانید واز دیدن ایں پرکار بسیار متعجب شدہ گفت کہ اکثر مردم از اعمال ایں پرکار آشنا نیستند چہ جائے صنعت آں کہ دریں جا کسے نمی داند ودر ولایت ہم ہر کس از صنعت ایں آگاہ نیست ومن ایں قدر می دانم کہ یک آلہ در گنج پرکار ہامی باشد باستعانت آں ایں پرکار درست می کنند مگر وضع درست کردن آں نمی دانم شما بدون آں چہ طور ساختید چوں ایں جانب گاہے گنج پرکار ہا نہ دیدہ بود مشتاق دیدن آں شدم ازشان گنج پرکار ہا از صندوقچہ خود برآوردہ بہ من ملاحظہ کنانیدند وچوں بران آلہ خطوط ورقوم بسیار دیدم واز اوشان استفسار حال آں نمودم گفتند کہ عمل دو سہ خط می دانم۔ چنانچہ روبروے بندہ عمل تقسیم خط واستخراج وتروجیب کردہ گفتند کہ من ہمیں قدر می دانم لیکن شنیدہ ام کہ ازیں آلہ اعمال بسیار از قسم دریافت ظل و قطر آں وخطوط متوالیہ واکثر اعمال نجوم می شود مگر من نمی دانم بلکہ اکثر صاحبانِ انگریز ہم نمی دانند اِلّا

مہندسان دانستم کہ پرکار متناسبہ ہمیں باشد و چوں آں گنج بسیار عمدہ و تحفہ بود نخواستم کہ آں رابعایت بگیرم اگرچہ دلم بسیار آرزومند شد بعد آں چند پرکار تقسیم برنجی مرتب کردہ رقوم آں بجائے انگریزی فارسی کندہ کردم و با شنایان خود دادم بعد چندے وارد کلکتہ شدم و یک گنج پرکار ہا خرید نمودم کہ دراں آلۂ مذکور ہم بود پس درپے دریافت اعمال آن شدم و فکر و سعی بسیا نمودہ و عمل استخراج ظل و قطر ظل و اکثر اعمال نجومی و ہندسی استنباط کردم چنانکہ مسودات بسیار شدند پس یقین شد کہ پرکا متناسبہ ہمیں است کہ سابق در عرب و عجم مروج باشد و حالا ایں کسے نمی داند و مختص در صاحبان انگریز و فرانس مروجست۔ پس آں مسودات اعمال رابطور قیاس خود مرتب نمودہ صاف کنانیدم و برائے یادگار و فائدۂ شائقانِ ایں علم رسالہ درست نمودم و نام ایں رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار نہادم، انتہی۔

ترجمہ

اس رسالہ کا مؤلف فریدالدین احمد کہتا ہے کہ چوں کہ مجھے لڑکپن سے علم ریاضی کا شوق تھا اور طلب علم کے زمانے میں اس علم کو کسی قدر حاصل کیا تھا اور اکثر ریاضی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ کسی کتاب کے حاشیے میں نظر سے گذرا تھا۔ آلات ریاضی میں سے ایک پرکار متناسبہ بھی ہے کہ اس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی مستخرج ہو سکتے ہیں مگر آج کل اس آلہ کی نایابی کی وجہ سے اس کا علم و عمل مفقود ہو گیا ہے اور یہ بات اپنے بعض استادوں کی زبانی بھی سن چکا تھا اس لئے اس آلہ کو دیکھنے کا شوق تھا جب کسی اور ریاضی داں سے اس کا ذکر کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ ہم نے تو یہ آلہ دیکھا نہ سنا۔ اس لئے پرکار تو بس یہی ہے جو دائرہ کھینچے اور خطوط کی پیمائش کے لئے کام آتی ہے، اس کے علاوہ اور کسی قسم کی پرکار نہیں ہو سکتی"۔۔۔ پھر ۱۲۱۲ھ (۷۔۱۷۹۸ء) میں لکھنؤ آیا اور جنرل مارٹین اور مسٹر گوراوزلی (جو حکیم مشرب تھے) سے ملاقات ہوئی ان کے پاس ایک عجیب و غریب آلہ دیکھا جو لوہے اور پیتل کا بنا ہوا تھا اور دو نوک دار حصے الگ الگ تھے اور اس کی کمر میں اس طرح میخ ٹھکی ہوئی تھی جس طرح قینچی میں ہوتی ہے مگر (فرق یہ تھا کہ) اس آلہ کی میخ اپنی جگہ سے حرکت کرتی تھی (اس میں پیچ تھا) تا کہ اس پیچ کو گھما کر ان دونوں حصوں کو دور و نزدیک کر سکیں۔ اور اس کی دونوں

سطحوں پر چند خطوط بھی تھے، میں نے کبھی اس قسم کا آلہ نہیں دیکھا تھا اس لئے دریافت کیا، کہنے لگے: انگریزی میں اس کے لئے ''پرکار تقسیم'' کا ہم معنی لفظ مستعمل ہے اور اس آلہ سے خطوط، دوائر، سطوح اور اجسام مختلفہ کی تقسیم بآسانی کی جاسکتی ہے، چونکہ وہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا اس لئے میں نے ان سے عارتیاً حاصل کیا اور خیال کیا کہ پرکار متناسبہ یہی ہے، مسٹر اوزلی نے چوں کے اس کے چاروں عمل (جو اس سے کئے جاتے ہیں) میرے سامنے کئے تھے، اپنے گھر لاکر میں نے بھی وہی اعمال کئے اور بہت سوچا کہ اعمال نجومی میں سے کوئی عمل اُس سے مستخرج کرسکوں مگر نہ ہوا، سوچا کہ یہ پرکار متناسبہ نہیں ہے مگر چند روز محنت کر کے اصول کی روشنی میں اس آلہ کے بنانے کا طریقہ دریافت کرلیا اور بالکل ایک چاندی کا پرکار بنایا مسٹر اوزلی نے وہ چاندی کا پرکار مجھ سے نواب وزیر سعادت علی خاں کو دیکھایا، مسٹر اوزلی میری پرکار دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے اکثر آدمی تو اس پرکار سے کام لینا بھی نہیں جانتے چہ جائے کہ اس کا بنانا یہ کام تو یہاں کوئی بھی نہیں جانتا اور ولایت میں بھی ہر شخص اس کو نہیں بنا سکتا، میں خود صرف اتنا جانتا ہوں کہ پرکاروں کے خانے (ڈوائڈرس بکس) میں ایک آلہ ہوتا ہے اس کی مدد سے اس پرکار کو صرف درست کیا جاتا ہے مگر کس طرح درست کیا جاتا ہے یہ نہیں جانتا تم نے اس آلہ کے بغیر یہ پرکار کیسے بنالی؟ میں نے چونکہ کبھی پرکاروں کا خانہ نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اُنھوں نے اپنے صندوق سے وہ خانہ منگا کر مجھے دکھایا (میں نے دیکھا کہ) اس آلہ پر بہت سے خطوط اور ہندسہ بنے ہوئے تھے میں مسٹر اوزلی سے ان کے متعلق دریافت کیا تو بولے کہ میں دو تین خطوں کا عمل جانتا ہوں چنانچہ میرے سامنے تقسیم خط اور استخراج وجیب کر کے کہنے لگے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں، لیکن سنا ہے کہ اس آلہ سے بہت اعمال (مثلاً سائے اور اس کے قطر کا دریافت کرنا) اور اکثر اعمال نجوم کئے جاتے ہیں مگر میں نہیں جانتا بلکہ اکثر انگریز نہیں جانتے، البتہ مہندس جانتے ہیں، اب میں نے خیال کیا کہ پرکار متناسبہ یہی ہے اور وہ خانہ (BOX) چونکہ بہت عمدہ اور قیمتی تھا اس لئے اگرچہ دل بہت تڑپتا تھا مگر میں نے ان سے وہ عاریتاً نہیں مانگا اس کے بعد پیتل کے چند پرکار تقسیم بنا کر ان پر انگریزی کے بجائے فارسی میں ہندسے لکھے اور اپنے ملنے والوں کو تقسیم کئے اس کے

چند دن بعد کلکتہ پہنچا تو ایک پرکار خانہ خریدا اُس میں وہ آلہ بھی تھا اور اب میں اس کے اعمال دریافت کرنے کے درپے ہوا اور بہت فکر وسعی کے بعد عمل استخراج ظل وقطر ظل اور اکثر اعمال نجومی و ہندسی مستنبط کیئے یہاں بہت سے مسودات تیار ہوئے۔اب یقین ہوگیا کہ پرکار متناسبہ یہی ہے جو پہلے عرب وعجم میں رائج تھی اور اب کوئی نہیں جانتا اور اس کا علم فرانس اور انگلستان والوں کے ساتھ مختص ہے، بہر حال ان مسودات کو اپنے ہی قیاس سے مرتب کر کے صاف کیا اور اس علم کے شائقوں کے لئے ایک رسالہ ترتیب دیا اور اس رسالہ کا نام ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' رکھا۔(مرتب)

مدرسۂ کلکتہ کی ملازمت

اس زمانے میں مدرسہ کلکتہ (۶) میں جس کو حکام انگریزی نے قائم کیا تھا ایک سپرنٹنڈنٹ مقرر کرنے کی ضرورت تھی جس کی تنخواہ سات سو روپیہ تھی۔ لکھنؤ میں جو حکام انگریزی تھے۔اُنھوں نے خواجہ فریدالدین احمد کی سفارش اُس عہدہ کے لئے کی اور اس پر ان کا تقرر ہوگیا۔اور وہ اسی سنہ میں یا اس کے تھوڑے زمانہ بعد کلکتہ پہنچے جیسا کہ خود اُنھوں نے اپنی اس کتاب کے دیباچہ میں بعد ذکر حالات لکھنؤ لکھا ہے کہ ''بعد چندے دارد کلکتہ شدم'' اُس زمانہ میں مارکوئیس آف ولزلی گورنر جنرل تھے۔خواجہ فریدالدین احمد نے کلکتہ میں پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا اور اپنا کام کرتے رہے۔

زمان شاہ کا عزم پشاور

اس زمانہ میں دلی میں شاہ عالم پادشاہ تھے اور ایران میں فتح علی شاہ اور مشہور ہورہا تھا کہ زمان شاہ کابلی (۷) نے ہندستان پر حملہ کرنے اور اس کے فتح کرنے کا ارادہ مصمم کرلیا ہے اور اس کے فرمان بھی راجگانِ پنجاب کے نام اس مضمون کے آگئے تھے کہ برسات کے بعد دہلی پر جو تختگاہِ سلاطین تیموریہ ہے یورش کروں گا اور سرکار انگریزی اس فکر میں تھی کہ کسی طرح زماں شاہ کا ہندستان پر یورش کرنا روکا جاوے۔

انگریزوں کا شاہِ ایران سے معاہدہ

اُس زمانہ میں انگریزوں کی طرف سے مسٹر مینسٹی بوشہر میں بطور سفیر کے متعین تھے اور سر پر فرڈ جیس بارونٹ بغداد میں اور مرزا مہدی علی خاں بہادر حشمت جنگ گورنر بمبئی کی طرف سے دربار ایران میں سفیر مقرر ہوئے تھے۔ وہ بوشہر میں آئے اور حاجی محمد خلیل خاں کے ذریعہ سے فتح علی شاہ پادشاہِ ایران اور وزرائے ایران سے اس امر میں خط وکتابت جاری کی اور زمان شاہ کے بھائیوں محمود شاہ وفیروز شاہ کو افغانستان پر حملہ کرنے کو آمادہ کیا۔ اس خبر کے سُنتے ہی زمان شاہ اطراف پشاور سے ہرات کو چلا گیا اور ہندستان پر حملہ کرنا ملتوی ہوگیا۔ اور کپتان مالکم سے جو بطور سفارت ایران پہنچ گئے تھے اور فتح علی شاہ سے رمضان ۱۲۱۵ھ مطابق ۲۸ر جنوری ۱۸۰۱ء کے ایک عہد نامہ تحریر ہو کر حاجی ابراہیم خاں وزیر اعظم شاہ ایران اور کپتان مالکم صاحب کے دستخط سے مکمل ہوا۔ اور جب کپتان جان مالکم دربار ایران سے واپس آئے تو فتح علی شاہ نے حاجی محمد خلیل خاں کو سفیر مقرر کر کے بمبئی کو روانہ کیا۔

بمبئی میں سفیر ایران کا قتل

حاجی محمد خلیل خاں ۲۲ر مئی ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۱۷ھ کے بمبئی پہنچے نہایت تعظیم وتکریم سے انگریزوں کی جانب سے استقبال ہوا اور جس مکان میں ٹھہرائے گئے وہاں ایک کمپنی سپاہیوں کی بطور اظہار تعظیم تعینات کی گئی۔

اتفاقاً ایک دن حاجی محمد خلیل خاں کے ساتھیوں اور کمپنی متعینہ کے سپاہیوں میں کسی امر میں تکرار ہوئی اور ہتھیاروں تک نوبت پہنچی۔ حاجی محمد خلیل خاں اُس جھگڑے کے رفع دفع کرنے اندر سے باہر نکلے اور اتفاقیہ ایک گولی اُن کے لگی اور وہ مارے گئے۔ یہ واقعہ ۲۰ر جولائی ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ کے واقع ہوا۔

ولزلی کی سفیر کے ورثا سے تعزیت

مارکوئیس آف ولزلی گورنر جنرل نے اس اتفاقیہ حادثہ پر بہت رنج اورافسوس ظاہر کیا۔ اور میجر مالکم اور مسٹر بوٹ کو جو کلکتہ میں تھے واسطے تشفی و دلدہی پس ماندگان حاجی محمد خلیل خاں کے بمبئی کو روانہ کیا۔ چنانچہ وہ ۳/ اگست ۱۸۰۲ء کو کلکتہ سے روانہ ہوئے۔ مسٹر بوٹ راہ میں بیمار ہو گئے اور میجر مالکم ۱۹/ ستمبر کو مچھلی بندر میں اور از راہ خشکی حیدر آباد دکن ہو کر ۱۰/ اکتوبر کو بمبئی پہنچے اور پسماندگان حاجی محمد خلیل خاں کو بخوبی تسلّی و تشفی کی اور نومبر ۱۸۰۲ء کو کلکتہ واپس چلے گئے۔ علاوہ اس کے مارکوئیس آف ولزلی نے ایک تعزیت نامہ مسٹر مینسٹی کے ہاتھ جو بصرہ میں بطور سفیر مقرر تھے۔ فتح علی شاہ کے پاس بھیجا اور فتح علی شاہ ایران نے بھی اس واقعہ کا اتفاقیہ ہونا تسلیم کیا۔

حشمت جنگ سفیر انگریزی کا عزل

اس زمانہ میں نواب مہدی علی خاں حشمت جنگ سرکار انگریزی کی طرف سے بوشہر میں سفیر تھے۔ مگر سرکار انگریزی نے کسی سبب سے ان کو اس عہدہ سے علیحدہ کر کے واپس بلا لیا۔

چنانچہ تاریخ سفارت حاجی محمد خلیل خاں و محمد نبی خاں میں جو ۱۸۸۶ء میں بمبئی میں چھپی ہے بصفحہ ۶۱ و ۷۰ یہ فقرہ لکھا ہے۔

"و قونسل گری بندر ابوشہر دریں آدان بہ نوب مرزا مہدی علی خاں حشمت جنگ بہادر حوالہ و چوں او می خواست کہ بدولت خود حسن خدمتی نماید و می خواست کہ مسئولیت و بار و تہمت مہمانکشی را از دوش دولت انگلیس بردارد لہذا بعقل ناقص خود تدبیرے اندیشد و از واقعۂ قتل حاجی خلیل خاں خبر ہائی دروغ بولایات اطراف انتشار می داد و ایں بطریقے کہ مسئولیت آں بہ خود آں مرحوم عاید می گردیدز حالاں کہ ہیچ حاجتے بہ انتشار آں نوع خبر ہائے دروغ نماندہ بود و حادثۂ مذکور امردم ایران بہ نظر تعجب ملاحظہ می کروند کہ آیا دریں کار چرا دولت انگلیس ایں ہمہ اصرار می کند و بجائے ایں ہمہ مصارف گزاف ہرگاہ یک سفیرے دیگر بدربار ایران فرستادہ بود ہر آئینہ ازیں بدنامی ہا بیروں می آمد و رضایت نامہ دربار

ایران را حاصل می نمود جماعت انگلیسیہ بدین سبب نواب ممدوح رامقصر نمودہ از بوشہر عزلش نمودند و مواجب دادند۔"

ترجمہ

"اس زمانے میں بندر شہر کی سفارت نواب مرزا مہدی علی خاں حشمت جنگ سے متعلق کی گئی اور چوں کہ وہ چاہتے تھے کہ حسن خدمت کا مظاہرہ کریں اور انگریزوں کے داغ دھوڈالیں اس لئے اپنے دماغ سے ایک تدبیر سوچی اور خلیل خاں کے واقعہ قتل کے متعلق جھوٹی خبریں قرب وجوار کے ممالک میں مشہور کرنے لگے، اور اس طرح کہ اس (حادثہ قتل) کی ذمہ داری خود آن مرحوم (خلیل خاں) پر عائد ہوتی تھی حالانکہ اب ان جھوٹی خبروں کے پھیلانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور ایران کے لوگ اس حادثہ کو حیرت سے دیکھتے تھے کہ آخر انگریزی حکومت کیوں اتنا اصرار کر رہی ہے اور ان فضول اخراجات کے بجائے جب دوسرا سفیر دربار ایران میں بھیج دیا ہے تو بے شبہ اس بدنامی سے محفوظ ہوگئی ہے اور دربار ایران کا رضایت نامہ حاصل کر چکی ہے"۔ اس لئے انگریزوں نے نواب ممدوح کو ناکام تصور کر کے بوشہر (کی مفارت) سے معزول کر دیا۔" (مرتب)

ایران میں مالکم کی سفارت

ان واقعات کے بعد گورنر جنرل مارکوئیس آف ولزلی نے ایک خط معذرت کا بنام شاہِ ایران اور ایک سفارت کا دربار ایران میں جس کا صدر مقام بوشہر میں رہتا تھا بھیجنا تجویز کیا اور مسٹر لوٹ جو بمبئی میں تھے خط معذرت لے جانے کو تجویز ہوئے اور میجر مالکم کے پاس بمبئی میں وہ خط بھیجا گیا کہ مسٹر لوٹ کے ہاتھ روانہ کیا جائے۔ مگر وہ بہ سبب بیماری کے نہ جا سکے اور میجر مالکم نے جو اس وقت بمبئی میں تھے بذریعہ اپنی چٹھی بنام چراغ علی خاں لکھا کہ مسٹر لوٹ کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے مسٹر پازلی کو نواب گورنر جنرل کا خط بنام شاہ سپرد کیا گیا ہے کہ وہ لے جاویں اور پھر اپنی چھٹی مورخہ ۲۷ را کتوبر

۱۸۰۱ء میں مسٹر ایڈ منسٹن پولیٹکل سکریٹری کو لکھا کہ مسٹر لوٹ کا عقب سے جانا ضرور ہے۔ مگر یہ خط معذرت گورنر جنرل کا بذریعہ مسٹر مینسٹی جو سفیر بصرہ میں تھے شاہ کی خدمت میں پہنچایا گیا جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اور اس کا ذکر تاریخ سفارت حاجی خلیل خاں و محمد نبی خاں میں جو ۱۸۸۶ء میں بمبئی میں چھپی ہے بصفحہ ۱۵ حسب ذیل مندرج ہے۔

''مارکویس ولزلی یک معذرت نامہ مصحوب مسٹر مینسٹی بالیوز بصرہ و دیگران با جامہ ہائے سیاہ کہ نشان عزاداریست بدربار ایران فرستاد و نامہ و ہدایائے فوق را ایشاں برداشتہ بحضور اعلیٰ حضرت علی شاہ رفتند کہ یک تن از مامورین نظام دیک کمپنی سپاہ نظام از تاریخ وقوع ایں حادثہ در بندر بمبئی محبوس ند و ایں حادثہ ناگاہ روے دادہ و اعلےٰ حضرت پادشاہی نیز از راہ مراحم بیکران شاہانہ برہائی محبوسین فرمان داد و نامہ و ہدایائے ایشاں راپذیرفتہ و مسٹر مینسٹی بمحل ماموریت خویشتن برگشت۔''

ترجمہ

مارکویس آف ولزلی نے ایک معذرت نامہ مسٹر مینسٹی سفیر بصرہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سیاہ لباس میں جو عزاداری کی علامت ہے، ایران کے دربار میں بھیجا اور یہ لوگ خط اور اس کے ساتھ تحائف لے کر اعلیٰ حضرت فتح علی شاہ کی خدمت میں گئے کہ نظام کے متعین کردہ لوگوں میں سے ایک شخص اور نظام کی فوج کی ایک کمپنی بمبئی کی بندرگاہ میں قید ہے اور (یہ کہ) یہ حادثہ اچانک رونما ہوا تھا (کوئی سازش نہیں تھی) اعلیٰ حضرت (فتح علی شاہ) نے بھی از راہ مراحم خسروانہ، قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر فرمایا اور ان (سفراء) کے خط اور تحائف کو قبول کیا، مسٹر مینسٹی اپنے مقام ملازمت پر واپس چلے گئے۔'' (مرتب)

خواجہ فرید وفد ایران میں

مرکویس آف ولزلی نے مسٹر بوٹ اور خواجہ فریدالدین احمد دونوں کا بھیجنا تجویز کیا۔ اُن کی

تاریخ روانگی ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہوتی مگر غالباً سن ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۸ھ کے روانہ ہوئے ہوں گے۔

کسی انگریزی تاریخ سے جہاں تک ہم نے تلاش کی مسٹر لوٹ کا ایران یا بوشہر پہنچنا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی روانگی بھی معلوم نہیں ہوتی۔ خواجہ فریدالدین احمد کا دستور تھا کہ وہ برابر اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ اور عہدِ شباب سے ان کے انتقال سے دو ہفتہ پیشتر کا روزنامچہ لکھا ہوا موجود تھا اور راقم نے بارہا اُس کو بطور ایک دلچسپ تاریخ کے پڑھا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ روزنامچہ تلف ہو گیا۔ راقم کو یاد پڑتا ہے کہ اس روزنامچہ میں لکھا تھا کہ ''مسٹر لوٹ بیمار ہو گئے اور گورنر جنرل کے حکم سے خواجہ فریدالدین احمد بطور سفیر مستقل کے روانہ ہوئے۔

بوشہر پہنچنے کے بعد وہ شیراز اور طہران میں گئے اور کئی دفعہ فتح علی شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور فتح علی شاہ کی مہربانی اُن کے حال پر خصوصاً بلحاظ ان کے اعلیٰ درجہ کے علوم ریاضیہ کے جاننے کے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

بوشہر اور شیراز اور طہران میں جو واقعات گذرے ہوں اُن کے بالتفصیل لکھنے کا بسبب تلف ہو جانے روزنامچہ کے کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ مگر جہاں تک کہ راقم کو بالاجمال یاد ہے وہ اس قدر ہے کہ خواجہ فریدالدین احمد نے شاہزادہ حسین علی میرزا اور صادق علی خاں نوای بیگلر بیگی (یہ وہی چراغ علی خاں ہیں جن کے نام میجر مالکم نے چٹھی لکھی تھی) سے دربار شاہی میں رسوخ رکھتے تھے بہت زیادہ دوستی پیدا کی تھی اور ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے جو سفارت کے تھے ان کو بخوبی انجام دیا تھا

ایرانی سفیر ہندوستان میں

بڑا مقصد اس سفارت کا یہ تھا کہ شاہ ایران کو بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے ہندستان میں دوسرے سفیر کے بھیجنے کی ترغیب دی جاوے تاکہ دوستی اور ارتباط دونوں سلطنتوں کا قائم رہے۔ اور شاہ کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ درحقیقت حاجی خلیل خاں کے مارے جانے کا واقعہ ایک امر اتفاقی تھا اور گورنمنٹ انگریزی کوئی الزام اُس کا اس مرحوم کی نسبت خیال نہیں کرتی جیسا کہ نواب مہدی علی خاں

نے اُس کو شہرت دی تھی۔ اس مقصد میں بخوبی کامیابی ہوئی اور شاہ نے دوسرا سفیر ہندستان میں بھیجنا منظور کرلیا اور محمد نبی خاں کا شاہ کی طرف سے بطور سفیر کے ہندستان میں بھیجنا تجویز کیا گیا۔

سفیر ایران سے خواجہ فرید کی دوستی

خواجہ فریدالدین احمد کی محمد نبی خاں سے بھی دوستی تھی اور جب کہ اُن کا ہندوستان میں بطور سفیر کے بھیجنا تجویز ہوا تو محمد نبی خاں نے بہت زیادہ راہ و رسم خواجہ فریدالدین احمد سے بڑھالی تھی۔ محمد نبی خاں کی سفارت ہندوستان کا مفصل حال تاریخ سفارت حاجی خلیل خاں و محمد نبی خاں مطبوعۂ بمبئی میں مندرج ہے۔ محمد نبی خاں کو شعر کا بھی مذاق تھا۔ اُس کی دوستی کا خواجہ فریدالدین احمد سے یہ بڑا ثبوت ہے کہ جب خواجہ فریدالدین احمد امور سفارت کے انجام دینے کے بعد شیراز سے بوشہر کو روانہ ہونے لگے تو محمد نبی خاں نے چند اشعار الوداعی بطور علامت دوستی کے تصنیف کر کے خواجہ فریدالدین احمد کو پیش کش کیے۔ وہ اشعار ہمراہ دیگر اشعار محمد نبی خاں کے تاریخ سفارت مذکورۂ بالا میں بصفحہ ۱۰۳ چھاپہ ہوئے ہیں جن کو ہم بلفظہ مع اُس عبارت کے جو ان کے عنوان پر لکھی ہے ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

قطعہ کہ بخواجہ فریدالدین احمد در شب روانگی ایشان از شیراز بندر ابوشہر بدیہہ نوشتہ شد

مشفقا امشب چو زلفِ گل رخاں ۔۔۔ خاطر جمعم پریشاں گشتہ است
حیرت افزاید مرا از خویشتن ۔۔۔ کز چہ رو احوالم اینساں گشتہ است
خاکدانِ دہر راز اب و ہوا ۔۔۔ آتشی گویا فروزاں گشتہ است
بردلم نہ از گلے خارے خلید ۔۔۔ تا بگویم اینم از آں گشتہ است
ہم یک امشب بندہ را مسر وردار ۔۔۔ دل ترا از جان چہ خواہاں گشتہ است
ہجر تو بس مشکل آید بر سفیر ۔۔۔ از چہ روپیش تو آساں گشتہ است

خواجہ فرید کی کلکتہ واپسی اور برما کا سفر

اس سفارت کے انجام دینے کے بعد خواجہ فریدالدین احمد بوشہر سے کلکتہ واپس آئے اُس وقت (۸) کوئی پولیٹکل امر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اداواقع برہما میں درپیش تھا۔ اُس کے طے کرنے کو خواجہ فریدالدین احمد گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے بطور ایجنٹ مقرر ہو کر ادا میں گئے اور اُس کو انجام دے کر پھر کلکتہ میں واپس آئے۔

بوندیل کھنڈ میں تحصیلداری

اُن کے واپسی کے تھوڑے عرصے پیشتر یعنی سن ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ میں ملک بندیل کھنڈ فتح ہو چکا تھا اور واسطے وصول مال گذاری کے وہ یکی پر تحصیلداروں کا تقرر ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ عہدہ نہایت معزز اور ذی اختیار تھا۔ اُن تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ ایک حصہ ملک کا سپرد ہو جاتا تھا اور جس قدر روپیہ وہ اُس ملک سے مال گذاری کا وصول کرتے تھے دس روپیہ سیکڑا حق التحصیل اُس میں سے لیتے تھے۔ خواجہ فریدالدین احمد ادا سے واپس آنے پر بوندیل کھنڈ میں اُس عہدہ پر مقرر ہوئے اور پرگنات اوگامی وغیرہ جواب ضلع باندہ میں شامل ہیں ان کے سپرد ہو گئے۔ جب یہ انتظام شکست ہو گیا اور کلکٹر اور معمولی تحصیلدار مقرر ہوئے اس وقت خواجہ فریدالدین احمد اُس عہدہ سے کنارہ کش ہو کر دلی میں واپس آئے۔

دہلی واپسی

خواجہ فریدالدین احمد ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء کے دلی سے نکلے تھے اور ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کے بارہ تیرہ برس کے بعد واپس آئے۔ اس عرصہ میں دلی میں بہت سے واقعات گذر چکے تھے۔

شاہ عالم

جب وہ گئے تو شاہ عالم بادشاہ تھے اُن کی آنکھیں نکل چکیں تھیں (۹) اور اُن کی حالت

نہایت خستہ اور خراب تھی۔ اُنھوں نے اپنی خستہ حالی کے بیان میں ایک غزل لکھی ہے اور ہر ایک سے ور نیز انگریزوں سے مدد چاہی ہے۔ ہم اس غزل کو بطور تاریخانہ یادگار کے اس مقام پر لکھتے ہیں۔ یہ زل مفتاح التواریخ مؤلفہ ولیم بیل میں بھی چھپی ہے مگر نہایت غلط چھپی ہے۔ ہم اس کو صحیح کی ہوئی ھاپتے ہیں اور جو اشارات اُس غزل میں ہیں حاشیہ پر اُس کی تصریح بھی لکھ دیتے ہیں۔ وہ غزل یہ ہے۔

صرصرِ حادثہ برخاست پی خواری ما — داد برباد سرو برگ جہاں داری ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم — بُرد ور شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشم ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد — تا نہ بینیم کہ کند غیر جہاں داریِ ما
داد افغاں (۱۰) بچہ شوکت شاہی بر باد — کیست جز ذات ممرّا کہ کند یاریِ ما
بود جاں کاہ زر و مال جہاں ہچو مرض — دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما
کردہ بودیم گناہی کہ سزایش دیدم — ہست امید کہ بخشند گنہ گاریِ ما
کردہ سی سال نظارت (۱۱) کہ مراداد بباد — زود تریافتہ پاداش ستم گاریِ ما
عہد و پیمان بمیان دادہ نمودند دغا — مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما
شیر دادم افعی بچہ راپرور دم — عاقبت گشت مجوز بگر فتاریِ ما
حق طفلاں کہ بسی سال فراہم کردیم — کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما
قوم مغلیہ د افغان ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند مجوز بگر فتاری ما
گل محمد کہ ز مروان بشرارت کم نیست — چہ قدر کرد وکالت پی آزاریِ ما
آں نیاز و و سلیمان و بدل بیگ لعیں — ہر سہ بستند کر بہر گر فتاریِ ما
شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بمدد گاریِ ما
مادھو جی سیندھیہ فرزند جگر بند نیست — ہست مصروف تلافی ستمگاریِ ما
ایں گدا زادہ ہمداں کہ بدوزخ برود — بانیِ جور و ستم شد بدل افگاریِ ما

آصف الدولہ وانگریز کہ دستور من اند | چہ عجب گر بنمایند مدد گارے ما
راجہ ورادو زمیندار۔امیر وچہ فقیر | حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما
ناز نینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودم | نیست جز مخلِ مُبارک بہ پرستاری ما
گرچہ ماازفلک امروزحوادث دیدیم | باز فرداد ہدایز دبسر سرداری ما

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

اس عرصہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۹ھ کے لارڈ لیک نے دلی کو فتح کرلیا اور انگریزی عمل داری دلی میں ہوگئی اور ۲۴ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو دلی کا انتظام جنرل اختر لونی کے سپرد کیا گیا۔ جنرل اختر لونی بطور رزیڈنٹ کے وہاں تھے اور کرنل برن بطور اعلیٰ افسر فوج کے۔ لارڈ لیک مرہٹوں کے مقابلہ میں مصروف تھے۔ ہولکر نے ۶ر اکتوبر ۱۸۰۴ء کو نواح متھرا میں لارڈ لیک سے شکست پائی اور دہلی کی طرف چلا۔ اور ۸ر اکتوبر ۱۸۰۴ء کو دہلی کی فصیل کے تلے پیادوں اور سواروں کی فوج اور سو توپیں لے کر آپہونچا اور دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ ایک میرے معزز بزرگ جو اس وقت میں جوان تھے مجھ سے کہتے تھے کہ اُنھوں نے دہلی کی فصیل پر چڑھ کر ہولکر کی فوج کو دیکھا۔ ایک لہراتا ہوا دریا سواروں کی فوج کا معلوم ہوتا تھا۔ اور یقین نہیں ہوتا تھا کہ دلی کے اندر جو قلیل فوج ہے وہ دلی کو بچا سکے گی اور اس فوج کو شکست دے گی۔

جنرل اختر لونی کو اس بات کی خبر پہنچ گئی تھی کہ ہولکر کا ارادہ دلی پر آنے کا ہے اُنھوں نے نہایت دانش مندی سے اُس سے کافی بندوبست کیا تھا۔ کرنل برن کو معہ فوج کے سہارن پور سے بلایا تھا۔ اور دولت راو والی جو بزیر کمان کپتان ہیر بٹ کے رہتک میں تھی اور نجیبوں کو جوزیر حکم لفٹنٹ برج کے پانی پت میں تھی دلی میں جمع کرلیا تھا۔ ہولکر نے ۸ر اکتوبر ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ کے دلی پر حملہ کیا۔ دہلی کی فوج نے گولہ باری شروع کی۔ کئی دن لڑائی رہی اور ہولکر کو شکست ہوئی اور بھاگ گیا۔ وہی میرے دوست کہتے تھے کہ ہولکر کے بھاگ جانے کے بعد میدان صاف دیکھ کر تعجب آتا تھا کہ ہولکر کی

اس قدر کثیر فوج کہاں غائب ہوگئی اور کون اس کو کھا گیا۔ پادشاہ نے جنرل اختر لونی کو نصیر الدولہ معز الملک وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کا خطاب عنایت فرمایا۔

اس کے بعد شاہ عالم ۷ر رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸ر دسمبر ۱۸۰۶ء کے مر گئے اور اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔

مرزا جہانگیر کا قضیہ

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایک سخت واقعہ پیش آیا۔ نواب ممتاز محل نے جو اکبر شاہ کی نہایت چاہتی بیوی اور مرزا جہانگیر اور مرزا بابر کی ماں تھیں یہ بات چاہی کہ مرزا ابولظفر عرف مرزا ابن جو سب سے بڑے بیٹے پادشاہ کے تھے اور جو اخیر کو بہادر شاہ ہوئے ولی عہد نہ بنائے جاویں۔ بلکہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں پادشاہ بھی اپنی چاہتی بیوی کی مرضی کے تابع تھے مگر حکام انگریزی اس کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ مرزا جہانگیر نے فساد کرنا چاہا اور قلع میں کچھ مسلح آدمی جمع کئے۔ اُس زمانہ میں مسٹر سیٹن رزیڈنٹ تھے۔ وہ مرزا جہانگیر کے سمجھانے کو قلعے میں گئے۔ مرزا جہانگیر نے اُن پر تپنچہ کی گولی چلائی۔ وہ بچ گئے۔ اور ان کی ٹوپی میں گولی لگی۔ وہ واپس آئے اور مرزا جہانگیر نے قلعہ کے دروازے بند کر لئے۔ مسٹر سیٹن رزیڈنٹ تھوڑی سی فوج لے کر گئے۔ قلعہ کا دروازہ اوکھاڑ کر اندر گھس گئے اور مرزا جہانگیر کو گرفتار کر کے قلعہ الہ آباد میں رہنے کے لئے روانہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ کے وقوع میں آیا۔ اس وقت مرزا جہانگیر کی عمر انیس یا بیس برس کی تھی اور اسی زمانے سے قلعہ کے دروازوں پر ایک کمپنی انگریزی فوج کی متعین ہوگئی۔ اور ایک کپتان قلعہ کے لاہوری دروازہ پر رہنے لگا۔ مرزا جہانگیر کا انتقال ۱۸۲۱ء مطابق ۱۲۳۶ھ کے الہ آباد میں ہوا۔ اوّل اُن کی لاش خسرو باغ میں دفن ہوئی۔ پھر دلی میں لائی گئی جس کا ذکر ہم آئندہ لکھیں گے۔

اکبر شاہ ثانی کی درخواست نامنظور

جب یہ واقعہ ہوا لارڈ منٹو گورنر جنرل تھے اور اکبر شاہ کی متعدد درخواستیں نسبت اپنے استحقاق اور اختیارات کے لارڈ منٹو کے سامنے پیش تھیں۔ مگر اس واقعہ کے بعد لارڈ منٹو نے سب کو نامنظور کیا اور صرف چھتر ہزار پانسو روپیہ ماہواری جس کا اقرار لارڈ ولزلی نے کیا تھا بطور پنشن کے مقرر کر دیا۔ جس کا اضافہ ایک لاکھ روپیہ ماہواری تک ہو گیا۔ بہادر شاہ کے وقت میں سوا لاکھ تک اضافہ کی تجویز ہوئی تھی مگر وہ جاری نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ اضافہ کا روپیہ بھی بادشاہی خزانہ میں آ گیا تھا۔ پھر واپس لے لیا گیا۔

خواجہ فرید پھر کلکتہ میں

خواجہ فریدالدین احمد بوندیل کھنڈ سے واپس آنے کے بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ مسمی وتحفۂ نعمانیہ، (۱۲) صنعت اصطرلاب میں ہمارے پاس موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء کے کلکتہ میں تھے۔ چنانچہ عبارت خاتمہ تحریر رسالہ مذکور یہ ہے۔ ''وتمت الرسالۃ جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ در کلکتہ فرید'' مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ کس سنہ میں دلی سے کلکتہ میں گئے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کی تنگ حالی

اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے۔ مگر اخراجات کی تنگی کا وہی حال تھا، جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعہ کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا۔ اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں بھوکے مرتے ہیں۔

اکبر شاہ کے عہد میں بھی یہی ابتری تھی۔ خرچ آمدنی سے بہت زیادہ قرضہ ہو گیا تھا اور تنخواہیں ملازمین اور شاہزادوں کی دو دو مہینے تین تین مہینے تک نہیں تقسیم ہوتی تھیں۔ اکبر شاہ کو ان

خرابیوں کے رفع ہونے کی نہایت فکر تھی اور اس بات کا بھی خیال تھا کہ دلی اور اُس کے مفصلات میں خالص بادشاہ کی حکمرانی رہنی چاہئے اور انگریزوں کو محاصل ملک سے تین لاکھ روپیہ ماہواری دینا لازم ہے۔

خواجہ فرید کی وزارت

سید محمد تقی خاں ابن جواد الدولہ جواد علی خاں مؤلف اس رسالہ کے والد اور خواجہ فرید الدین احمد کے داماد کو دربارشاہی میں پشتنی رسوخ تھا اور اکبر شاہ سے اُن کے زمانہ شہزادگی سے بہت زیادہ راہ ورسم تھی اور پادشاہ کبھی کبھی بھائی متقی کہہ کر مخاطب کرلیا کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے سید محمد متقی سے چاہا کہ وہ انتظام امور پادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اوران خرابیوں کا انتظام کریں۔ سید محمد متقی نے تو اس سے عذر کیا۔ مگر اپنے خسر خواجہ فرید الدین احمد کا اور اُن کی سفارت ایران اور اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دی کہ اُن کو بُلا کر وزیر کیا جائے تو غالبًا سب اُمور کا انتظام ہوجائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو پسند کیا اور خواجہ فرید الدین احمد کو کلکتہ سے بُلانے کا حکم دیا۔ اور وہ کلکتہ سے اُسی سال یعنی ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء کے دلی میں آئے۔ پادشاہ کی ملازمت کی۔ اکبر شاہ نے اُن کو وزیر مقرر کیا۔ خلعت وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا عطا کیا۔

خواجہ نے شاہ کی مشکلات کے حل ڈھونڈھ لئے

خواجہ فرید الدین احمد نے اپنے ایام وزارت میں اس وجہ سے کہ پادشاہ قرض دار ہوگئے تھے قرضہ ادا کرنے اور اخراجات برابر کرنے کی تین تدبیریں کیں۔ تمام شاہزادگان و بیگمات و ملازمان و عملۂ شاہی کی تنخواہوں سے دس روپیہ فی صد تنخواہ کم کردی اور دو مطبخ یعنی شاہی باورچی خانے جو بڑے خاصہ (۱۳) اور چھوٹے خاصہ، (۱۴) کے نام سے موسوم تھے۔ اور جن کا روزانہ صرف کثیر تھا۔ اور اسی کے ساتھ بعض دیگر غیر ضروری کارخانہ جات کو موقوف کردیا۔ اور تیسرا کام یہ کیا کہ دیوانِ عام کی چھت

جس میں تانبے کی موٹی چادریں بطور چھت گیری کے لگا کر اُس پر پیتل کی ڈنڈیوں و پھولوں سے جن پر سنہری ملمع تھا بطور خاتم بندی کے بنائی گئی تھی اور جس کو بعہد شاہ عالم ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء کے بھاو مرہٹہ نے اُکھاڑ ڈالا تھا اور لے نہ جاسکا تھا اور وہ سب اُکھڑی ہوئی پڑی تھی اور پھر اُس کا بنانا بنظر حالات شاہی غیر ممکن تھا اُس کا سونا الگ اُتروالیا اور جس قدر تانبا تھا شاہی ٹکسال میں اُس کے پیسے بنواڈالے (غدر سے پہلے تک یہ پیسے دلی میں مروّج تھے) اور پیتل فروخت کر دیا اور اس تدبیر سے کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا۔ ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا۔

اہل قلعہ کی ناخوشی

مگر شاہزادے اور بیگمات اور وزباری سب اس بات سے کہ اُن کی تنخواہیں کم ہو گئیں تھیں نہایت ناراض تھے اور خاصوں اور کارخانہ جات کی موقوفی عام شکایت کا باعث تھی۔ ان اسباب سے ہر شخص نے پادشاہ کے پاس شکایتیں شروع کیں۔ دیوان عام کی چھت کی نسبت جو کچھ کیا گیا تھا وہ پادشاہ کی اجازت اور مرضی سے کیا گیا تھا۔ مگر تمام لوگ چرچا کرتے تھے کہ دیوان خاص کی چاندی کی چھت نادر شاہ نے لوٹ لی۔ اور دیوان عام کی تانبے کی چھت خواجہ فرید نے رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر پادشاہ کے دل پر بھی ہوا اور دبیر الدولہ نے عہدہ وزارت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا مناسب نہ جانا۔ یا یہ کہ وہ زیادہ اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے۔ اُنھوں نے اس عہدہ سے استعفا دیا اور چند روز بعد پھر کلکتہ چلے گئے۔

خواجہ فرید کا استعفاء

ان کے بعد کے تمام اختیارات وزارت نواب ممتاز محل کے جو پادشاہ کی بیگم تھیں کہ قبضۂ اقتدار میں چلے گئے اور انھیں کی طرف سے مختلف اشخاص وزارت کا کام انجام دیتے تھے۔

ان واقعات کے چند روز بعد پادشاہ نے پھر واسطے اضافہ پیشکش کے تحریک کرنی چاہی اور اس باب میں ایک مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا۔ جس میں زیادہ تر شکایت اس بات کی تھی کہ آمدنی واسطے اخراجات ضروری کے کافی نہیں ہے۔ سید محمد متقی خاں نے موقع پا کر پادشاہ سے عرض کیا کہ دبیر الدولہ کلکتہ میں موجود ہے اور آمدنی اور اخراجات کا حال اُن کو معلوم ہے اور کاغذات جمع خرچ کی یادداشتیں بھی ان کے پاس ہیں اور درحقیقت آمدنی وخرچ برابر ہو گیا ہے اور قرضہ بھی ادا ہو گیا ہے۔ اگر گورنر جنرل ان سے دریافت کرے تو بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بالفعل آمدنی اور خرچ برابر ہے۔ قرضہ بھی نہیں ہے۔ اس وقت جو مراسلہ کا بھیجنا تجویز کیا گیا ہے وہ کیوں کر تسلیم ہوگا۔

دوبارہ وزارت

پادشاہ کے دل میں اس بات نے جگہ کی اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو مگر اس کی تدبیر کیا ہے۔ سید محمد متقی خاں نے عرض کیا کہ خواجہ فرید کا علاحدہ کر دینا مصلحت نہیں تھا۔ اگر اس میں کچھ سعی وکوشش ہو سکے گی تو دبیر الدولہ ہی کی تدبیر وکوشش سے ہو سکے گی۔ پادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیر الدولہ کے کلکتہ سے بلانے کو حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کے بدستور اپنے عہدہ سابق پر مامور رہے۔

اس دفعہ کے تقرر میں بھی نواب دبیر الدولہ نے درحقیقت ماہواری پنشن کے اضافہ کو جو بنام پیش کش، پادشاہ کے لئے مقرر تھی کوئی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ لیت ولعل کرتے رہے جس کے سبب سے پادشاہ کی کبیدگی خاطر بڑھتی جاتی تھی۔ جو لوگ اُن کے مخالف تھے اُنھوں نے پادشاہ کے دل میں یہ بات جمائی کہ دبیر الدولہ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں اور اس لئے اُس میں کوشش نہیں کرتے اور لوگوں کو بھی تعجب تھا کہ وہ کیوں اس میں تساہل کرتے جاتے ہیں آخر کار پادشاہ نے یہ بات چاہی کہ وزارت کے کام میں اور شخصوں کو بھی دبیر الدولہ کے شریک کیا جائے۔ اس شراکت کے تین شخص خواہاں ہوئے۔

ایک نواب محمد میر خاں جن کے باپ شاہ جی اُس زمانہ میں دہلی کے صوبہ دار تھے جب کمپنی انگریز نے دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ دوسرے راجہ کیدار ناتھ اور تیسرے راجہ جی سکھ رائے۔

یہ واقعہ جولائی ۱۸۲۰ء کا ہے جو مطابق ۱۲۳۶ھ کے (واضح ہو کہ اس واقعہ کا سال ہم کو جنرل گارڈنر کے روزنامچہ سے جو ان کے خاندان میں محفوظ ہے اور جو کاسگنج ضلع ایٹہ میں ہے دستیاب ہوا ہے) مگر نواب ممتاز محل راجہ جی سکھ رائے کی طرفدار تھیں اور وہ چاہتی تھیں کہ سب کو نکال کر راجہ جی سکھ رائے کو مقرر کیا جاوے۔ دبیر الدولہ اُن کی شرکت میں کام کرنا منظور نہیں کرتے تھے۔ چند روز اسی طرح فقرہ بازیاں اور تدبیریں رہیں آخر کار بصلاح جنرل اکٹرلونی کے جو رزیڈنٹ تھے اور دبیر الدولہ سے نہایت دوستی رکھتے تھے ۱۸۲۲ء مطابق ۱۲۳۸ھ کے دبیر الدولہ نے استعفا دے دیا۔ اس دفعہ غالباً تین برس یا ساڑھے تین برس تک اُنھوں نے وزارت کا کام انجام دیا۔

ایک یادگار تصویر

اس میں شاہزادوں اور امرا کے دو گرہوں میں جو پادشاہ کے روبرو کھڑے ہیں دو شکلیں جنرل اکٹرلونی اور وزیر اعظم خواجہ فریدالدین احمد کی ہیں۔ جو برابر کھڑے ہیں۔ جنرل پوری پوشاک پہنے، آڑی ٹوپی رکھے جریب (۱۵) یا عصائے عزت پر جھکے ہوئے ہیں۔ وزیر اعظم کے پاس بھی جریب ہے۔ یہ تصویر جشن کے دربار کی ہے جو دیوان خاص میں ہوتا تھا۔ دیوان عام کا دربار بہت دنوں سے موقوف ہو چکا تھا۔ بادشاہ تخت طاؤس پر بیٹھے ہوئے ہیں جو اصلی تخت طاؤس (۱۶) شاہجہانی کی نقل بنایا گیا تھا۔

آکٹرلونی

جنرل اکٹرلونی اور وزیر اعظم دبیر الدولہ خواجہ فریدالدین احمد میں بڑی دوستی تھی۔ جنرل اکٹر لونی اکثر دبیر الدولہ پاس جب چاہتے آیا کرتے تھے، اور اس لئے دبیر الدولہ کی مسند کے پاس ہمیشہ

ایک نہایت عمدہ لال مخمل کی آرام کرسی رکھی تھی کہ جب وقت بے وقت جنرل صاحب آویں تو اُس پر بیٹھیں۔ دبیر الدولہ اپنی مسند پر اور جنرل اکٹرلونی اُس کرسی پر بیٹھتے تھے۔

لونی سے سرسید کا سوال

ایک دن جنرل اکٹرلونی آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً راقم کسی سبب سے وہاں گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا۔ مگر اُنھوں نے بلالیا اور کچھ بات کی راقم نے جنرل سے جو فل ڈریس پوری پوشاک یا وردی) پہنے ہوئے تھے پوچھا کہ ”آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دو بٹن کیوں لگائے ہیں“۔ جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ اس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس کی ہوگی۔

نادانی کا کام

دبیر الدولہ کے استعفے کے بعد راجہ جی سکھ رائے زیادہ محیط ہو گئے اور کارکنانِ سلطنت نے پادشاہ کے مقاصد پورا ہونے کو زیادہ تدبیر کرنی چاہی جو محض نادانی کا کام تھا۔ (۱۷)

رام موہن رائے

اُنھوں نے رام موہن رائے کو جو کلکتہ کے ایک بابو اور نہایت لائق اور ذی علم اور متین۔ مہذب و با اخلاق تھے اور وہی برہما سماج مذہب کے جواب بنگالوں میں نہایت کثرت سے رائج ہے۔ بانی ہیں بلایا۔ اس ارادہ سے کہ پادشاہ کی طرف سے وکیل کر کے لندن بھیجا جاوے۔ چنانچہ وہ دلی میں آئے اور پادشاہ کی ملازمت کی اور اُن کو راجہ کا خطاب پادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور آخر کار وہ پادشاہ کے وکیل ہو کر لندن میں بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ کے لندن پہنچے اور ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ کے وہیں مر گئے (راقم نے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا ہے اور دلی کے لوگ یقین

کرتے تھے کہ ان کو مذہب اسلام کی نسبت زیادہ رجحان خاطر ہے) مگر اس کارروائی سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا۔

بہادر شاہ بھی ناکام رہے

بہادر شاہ کے عہد میں بھی اس باب میں کوشش کی گئی اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب (۱۸) جو پادشاہی امور کے کارکن تھے۔ خود کلکتہ گئے اور وہاں سے ایک انگریز (۱۹) کو اپنے ساتھ لئے اور پادشاہ کی طرف سے اُس کو وکیل کر کے لندن کو روانہ کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ رہا۔

ناکامی کا اصلی سبب

اس ناکامی اصلی سبب (۲۰) یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم اور لارڈ لیک سے جو اقرار و معاہدے ہوئے تھے اس کے برخلاف شاہ عالم نے کوئی شقہ مرہٹوں کے نام لکھا تھا، جب کہ مرہٹوں اور لارڈ لیک میں لڑائی ہو رہی تھی۔ وہ شقہ لارڈ لیک کے ہاتھ آ گیا تھا اور اس سبب سے جو معاہدے لارڈ لیک نے اس کے قبل شاہ عالم سے کئے تھے وہ سب زائل اور ساقط ہو گئے تھے اور اس لئے درحقیقت شاہ عالم اور کمپنی انگریز کو اختیارِ کُلّی حاصل تھا کہ پادشاہ اور خاندانِ شاہی کے ساتھ بلحاظ مصلحت ملکی جس طرح پر چاہے کارروائی کرے۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کو علانیہ ظاہر نہیں کیا۔ مگر یہی وجہ تھی کہ تمام درخواستیں اور خواہشیں پادشاہ کی جو بربنائے عہد اور میثاق لارڈ لیک کے تھیں ان پر کچھ التفات نہیں ہوتا تھا۔

رنجیت سنگھ کی خواجہ فرید کو دعوتِ وزارت

وزارت سے استعفا دینے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد اور تیس ہزار روپیہ (۲۱) بطور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں۔

مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی والدۂ راقم نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جاوے تو بھی جو آرام و آسائش آپ کو اب ہے اُس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور میں جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کا انگریزوں کی عمل داری میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آویں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آجاوے پس اس زمانۂ ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے، وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا اور پھر آخر عمر تک باوجودے کہ پھر پادشاہ کی طرف سے ایک دفعہ تحریک ہوئی مگر کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

وفات

غرض کہ خواجہ فریدالدین احمد نے ایسی خوش زندگی بسر کر کے ۱۴ رمحرم ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء کے انتقال کیا۔ بیرون ترکمان دروازہ چونسٹھ کھمبہ میں جو ایک مشہور تکیہ شاہ فدا حسین کا تھا دفن کیئے گیے۔ اُن کی قبر پر نہایت عمدہ نفیس عمارت بنائی گئی۔ ان کے بیٹوں نے اُن کی رسم سوم و چہلم میں ہزارہا روپیہ خرچ کیا۔ اُن کے مزار پر سالہا سال تک بسنت چڑھتی تھی اور ایسا عمدہ نفیس میلہ بہ سبب قرب شہر کے ہوتا تھا کہ تمام درگاہوں میں جو بسنتیں ہوتی تھیں سب مات ہو گئی تھیں۔

تاریخ وفات

اُن کے چھوتے بیٹے نواب زین العابدین خاں نے مادۂ تاریخ وفات "جا بہ بہشت یافتم" نکالا اور اس کو بطور قطعہ کے موزوں بھی کیا تھا جو راقم کو یاد نہیں رہا۔ زمانۂ تحریر اس رسالہ میں یعنی ۲۵ راگست ۱۸۹۳ء کو میں نے اُس کا مولانا خواجہ الطاف حسین حآلی سے کیا اُنھوں نے اُس تاریخ کو اس طرح پر موزوں کر دایا۔

رخت سفر چو از جہاں خواجہ فرید دیں بہ بست

از پے سال رحلتش سوئی بہ سو شتافتم

روئے نمود ناگہاں خواجہ شمی بہ خواب در

دیدہ وخندہ باز گفت "جا بہ بہشت یافتم"

۱۲۴۴ء

ان کے انتقال کے کئی دن بعد مسٹر کول بروک جو اس زمانہ میں دہلی میں رزیڈنٹ تھے۔ اور مسٹر ٹرولیس جو اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے۔ بطور ماتم پرسی کے آئے۔ اُس وقت دبیر الدولہ کے بیٹے اور داماد اور پوتے اور نواسے سب موجود تھے۔ ان سب کو مخاطب کر کے کلمات تعزیت کہے اور بذریعہ پیغام کے کلمات محل سرا میں اُن کی بیٹیوں کو کہلا بھیجے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ جو اس وقت موجود تھے نہایت مہربانی سے پیش آئے اور دبیر الدولہ کی وفات پر نہایت تاسف ظاہر کیا۔

نواب دبیر الدولہ نے نہایت عمدگی و خوبی و شان و شوکت امیری و نام آوری میں آخر عمر تک اپنی زندگی بسر کی۔ تمام روسا اور امرا اور شرفائے شہر ان کا نہایت ادب اور اعزاز کرتے تھے ان کے مزاج میں بہت زیادہ نفاست تھی۔ جس قدر اُن کا لباس فرش اور تمام چیزیں اوجلی رہتی تھیں ان کا بیان مشکل ہے۔ علم سے اور بالتخصیص ریاضیات سے نہایت شوق تھا۔ اُن کا معمول تھا کہ دو تین طالب علموں کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ متعدد طالب علموں میں سے ذہین اور سمجھ دار منتخب کر لیتے تھے اور اگر کوئی امداد کا مستحق ہوتا تھا اس کا وظیفہ مقرر کر دیتے تھے۔

خواجہ فرید کے تلامذہ

مولوی کرامت علی صاحب (تفصیلی حالات شخصیات میں ملاحظہ ہوں) ابن مولوی حیات علی صاحب جو دلی کے مشہور عالم تھے۔ اور آخیر کو حیدر آباد چلے گئے اور مولوی رجب علی صاحب (تفصیلی حالات شخصیات میں ملاحظہ ہوں) شیعہ مذہب جنھوں نے آخر کو پنجاب میں نہایت عروج

پایا اور خواجہ محمد ناصر جان جو بعد خواجہ محمد نصیر (تفصیلی حالات شخصیات میں ملاحظہ ہوں) کے سجادہ نشین حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ ہوئے اور حکیم رستم علی خاں (تفصیلی حالات شخصیات میں ملاحظہ ہوں) اُن کے مشہور شاگردوں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں نے جو اپنے وقت میں علم ہیئت اور زیچ دانی اور علم اور صنعتِ آلات رصد میں بے مثل تھے اُنھیں سے وہ سب علوم سیکھے تھے۔ علم ریاضی گویا ہمارا خاندانی علم ہو گیا تھا۔

کتب خانہ

کتاب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ ان کے بڑے کتب خانہ کی کوئی کتاب کسی قسم کی اور کسی فن کی ایسی نہ تھی جو ان کی نظر سے نہ گذری ہو۔ اُن کا دستور تھا کہ جونئی کتاب آتی تھی، یا لی جاتی تھی، جب تک کہ وہ نہ پڑھ لیں کتب خانہ میں داخل نہ ہوتی تھی۔ ان کے کتب خانہ کی کتابوں کی بڑی شناخت یہ تھی کہ ان پر کسی نہ کسی جگہ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا حاشیہ ہو یا کسی نعت کے معنی ہوں یا کسی مسئلہ کی تحقیق ہو۔

انگریزی زبان سے واقفیت

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ مگر ان کے کتب خانہ کی انگریزی کتابوں پر بھی کسی لفظ کے معنی لکھے ہوئے ان کے ہاتھ کے پائے جاتے تھے اور نیز بعض اور وجوہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی نہ کسی قدر انگریزی آتی تھی کم سے کم یہ کہ بول لیتے اور پڑھ لیتے تھے۔

خواجہ فرید کے رسائل

ان کے تصنیف کئے ہوئے متعدد چھوٹے رسالے علم ہیئت اور آلات صدر میں تھے جو غدر میں ضائع ہو گئے۔ مگر ان کے تصنیف کئے ہوئے اور اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تین رسالے

ایک صنعت اصطرلاب کا دوسرا صنعت پرکار متناسبہ کا اور تیسرا اعمال پرکار متناسبہ کا بعنایت وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں بہادر سی۔آئی۔ای وزیر اعظم ریاست پٹیالہ ہم کو دستیاب ہوئے ہیں جن کو ہم نے کتب خانہ مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا ہے۔خدا کرے صدہا سال تک اُس کتب خانہ میں محفوظ رہیں۔

بخشی محمود خاں

نواب دبیر الدولہ کی مجلس ایسی مؤدب اور شائستہ ہوتی تھی کہ جس میں جا کر ایک عظمت و شان معلوم ہوتی تھی۔تمام لوگ نہایت ادب اور شائستگی سے خاموش بیٹھے ہوا کرتے تھے۔کوئی فضول بات بجز کام کی باتوں کے یا کسی علمی مسئلہ کے اور بعض دفعہ تصوف کے مسائل کے اور کچھ ذکر نہیں ہوتا تھا۔بخشی الممالک بخشی محمود خاں (۲۲) بھی جو مثل ہزار داستان کے گویا اور نہایت خوش مزاج اور ظریف شخص تھے وہ بھی اُن کی مجلس میں نہایت مؤدب رہتے تھے اور کہتے تھے کہ میں ہندوستان میں نواب دبیر الدولہ کو نہایت ادب کے لائق سمجھتا ہوں مگر ان کے بیٹوں کے ساتھ دوستانہ ملاقات رکھتے تھے اور اکثر آیا کرتے تھے اور ہر وقت ظرافت آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔

بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے۔ان کی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا جس میں ٹ اور ڈ ہوتی تلفظ نہیں ہو سکتا تھا۔جب بخشی محمود خاں آتے تو اکثر ہم لڑکوں کو جو پوتے اور نواسے نواب دبیر الدولہ کے تھے اور مکتب میں پڑھتے تھے بلواتے اور ٹوپی ٹوپی کی شرط بد کر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمائش کرتے۔جب وہ پوری طرح پر تلفظ نہ ہوتا تو اُس لڑکے کی ٹوپی لے لیتے لڑکے بھی ان سے ہندوستانی لفظوں کی فرمائش کرتے۔"ٹو بھر دو تائے ثقیل کا تلفظ ان سے نہیں ہو سکتا تھا ہمیشہ تو یا لتا کہتے تھے۔ لڑکے شرط جیت جاتے اور اُن کی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے بھی ان کی ٹوپی نہ دیتے۔غرض کہ بخشی محمود خاں نہایت خوش مزاج اور ظریف آدمی تھے۔بادشاہ کے دربار میں نہایت خوش بیانی سے جھوٹے سچے قصے بیان کرتے تھے۔جب بادشاہ ان سے ہم کلام ہوتے تھے تو

ایسے مصروف ہو جاتے تھے کہ کسی دوسرے کو کلام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ بااین ہمہ نواب دبیر الدولہ کی مجلس میں نہایت ہی ساکت اور مؤدب رہتے تھے۔

خواجہ فرید کے معمولات

نواب دبیر الدولہ کا معمول تھا کہ صبح کا کھانا محل سرا میں جا کر کھاتے تھے۔ ایک بہت بڑے نعمت خانے میں بہت وسیع دسترخوان بچھا ہوتا تھا اور کل بیٹے اور بیٹیاں اور پوتے اور پوتیاں۔ نواسے اور نواسیاں اور بیٹوں بیویاں اور چھوٹے و بڑے سب ان کے ساتھ کھاتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں اور وہ ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کونسی چیز کھاؤ گے۔ جب وہ بتاتا تو اس کے آگے خالی رکابی میں اپنے ہاتھ سے وہی چیز چمچہ سے اُٹھا کر بقدر مناسب عنایت فرماتے تھے۔ تمام لڑکے نہایت ادب وصفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بڑی احتیاط رہتی تھی کہ کوئی چیز گرنے نہ پاوے اور زیادہ ہاتھ کھانے میں بھرنے نہ پاویں۔ نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نکلنے نہ پاوے۔

رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ اُن کی بڑی بیٹی یعنی راقم کی والدہ اور چھوٹی بیٹی فخر النساء بیگم کھانا کھلاتی جاتی تھیں۔

یہ بھی دستور تھا کہ شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے۔ سبق سناتے جاتے تھے۔ اُن کے مسند کے آگے دو سفید رنگ کے شیشے کی فانوسیں جو مردنگین کہلاتی ہیں موم بتی سے روشن ہوئی رکھی رہتی تھیں اور ان کے سامنے لڑکے بیٹھتے تھے۔ اول مشکل یہ تھی کہ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا۔ لڑکے اپنے پاوں نہایت صاف رکھتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں چاندنی پر دھبہ نہ لگ جاوے۔ اگر اتفاق سے کسی لڑکے کے پاوں کا دھبہ لگ گیا تو نہایت خفگی سے اس کو بھگا دیتے تھے کہ، کتنے کے سے پاؤں کیوں رکھتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ کپڑے پر کسی قسم کا دھبہ یا روشنائی گری ہوئی نہ ہو۔ اگر اُسی وقت دوسرے سفید کپڑے پہن کر جاتے تو ناراض ہوتے اور کہتے کہ، کیا تو چماروں کے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا کہ بدل کر آیا ہے۔"

سر سیّد کا سبق

سب لڑکے باری باری سے سبق سُناتے اور جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی نفیس مٹھائی اکثر بادام کی خانہ ساز لوزاتیں ملتی تھیں اور جس کو یاد نہ ہوتا تھا اس کو نہیں دی جاتی تھیں اور گھڑک دیتے تھے۔ نہایت سخت اور خفگی کا لفظ جو ان کی زبان سے کسی کی نسبت نکلتا تھا وہ لفظ، بے پیر تھا۔

راقم جس زمانے میں بوستاں پڑھتا تھا حسب دستور سبق سنانے گیا اُس سبق میں یہ شعر بھی تھا۔

طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی دزاں نیست مر مطمعاں را بہی

پہلے مصرعہ کا میں نے ترجمہ کیا کہ، طمع کے تین حرف تینوں خالی، اُنھوں نے کہا ہونہ، میں سمجھا کہ میں نے غلط پڑھا۔ پھر غور کیا، پھر وہی معنی کہے۔ اُنھوں نے پھر ٹوکا۔ تیسری دفعہ بھی وہی معنی کہے۔ وہ خفا ہوئے اور کہا۔ بے پیر سبق یاد نہیں کرتا، کچھ بتایا اور نہ مجھ کو کچھ دیا۔ جس قدر مُجھ کو رنج ہوا اور برابر آنسو آنکھوں سے جاری ہوئے وہ اب تک مُجھ کو یاد ہے۔ بہت دیر کے بعد میں سمجھا کہ است کے معنی میں نے نہیں کہے تھے۔ ہمارے بھائیوں نے ہم کو چڑایا، اور کہا کہ ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد۔''

مُکّا شاہ کے مرید تھے

نواب دبیر الدولہ درحقیقت حکیم مشرب یا صوفی مذہب تھے۔ کسی زمانہ میں مکا شاہ کے جو نہایت معزز چیلے رسول شاہ جی کے تھے مرید ہوئے تھے۔ رسول شاہیوں کے جو مرید تھے اُن کو خواہ مخواہ یہ ضرور نہ تھا کہ تجرد اختیار کریں اور ڈارھی مونچھ کا صفایا کردیں بلکہ وہ بھی اُن کے مریدوں میں داخل تھے جو تاہل کرتے تھے اور دنیاداروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی حال نواب دبیر الدولہ کا تھا۔ مگر دو برس قبل اپنی وفات کے ان کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو اپنے مرشد کے طریقے میں پورے طور پر داخل ہونا چاہیئے۔

چار ابرو کا صفایا کر دیا

حجام جو حاضر ہوا اس سے کہا کہ داڑھی مونچھ کا صفایا کر دے اُس نے اس نورانی اور نہایت خوبصورت داڑھی اور مونچھوں کو مونڈ دیا شہر میں اُس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے نہایت تعجب کیا۔ مگر ان کو اس کی پروا نہ تھی۔ ایک دفعہ کے سوا پھر داڑھی مونچھ کا صفایا نہیں کیا۔ اور جب انتقال ہوا ہے تو داڑھی کسی قدر بڑی ہو گئی تھی۔

لالہ ملوک چند

نواب دبیر الدولہ کے ذکر کے ساتھ ان کے نہایت قدیم اور پرانے دیوان لالہ ملوک چندؒ کا ذکر نہ کرنا نہایت ناانصافی ہو گی۔ یہ ان کے بہت قدیم دیوان تھے اور نہایت فہمیدہ اور سنجیدہ تھے۔ نواب دبیر الدولہ کے مزاج میں بھی کسی قدر دخل تھا اور وقت بے وقت ہر ایک بات عرض کر سکتے تھے۔ نواب ممدوح بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ قبل انتقال جب نواب صاحب نے اپنی جایداد تقسیم کی تو جس قدر روپیہ اپنے بھائیوں کو دیا اسی قدر اس قدیم ملازم کو بھی دیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد لالہ ملوک چند تا روز مرگ نواب زین العابدین خاں کے ملازم رہے۔ باوجودے کہ ان کے بیٹوں کو بہت عروج ہو گیا تھا مگر انھوں نے اپنی قدیم ملازمت کو نہیں چھوڑا تھا۔

خواجہ وحید الدین

دبیر الدولہ کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ زین العابدین خاں تھا۔ جب مرزا جہانگیر کا الہ آباد میں انتقال ہوا اور وہ زمانہ نواب دبیر الدولہ کی وزارت کا تھا تو مرزا جہانگیر کی لاش الہ آباد سے دلی میں لانے کو خواجہ وحید الدین احمد تجویز ہوئے۔ وہ الہ آباد گئے اور مرزا جہانگیر کی لاش وہاں سے لے آئے اور متصل مرزا حضرت سلطان نظام الدین مدفون ہوئے۔

اس وجہ سے نواب ممتاز محل کو وحیدالدین احمد خاں پر حد سے زیادہ مہربانی ہوگئی۔اور کہا کرتی تھیں کہ "وحیدالدین خاں کو مرزا جہانگیر کے برابر سمجھتی ہوں۔اور مرزا تیمور شاہ جو ایک صغیر سن بیٹے مرزا جہانگیر کے تھے ان کی گود میں دیا اور مرزا تیمور شاہ کی سرکار بجائے مرزا جہانگیر کی سرکار کے نہایت شان وشوکت سے قائم ہوئی اور وحیدالدین خاں اس کے مختار کل مقرر ہوئے اور مختار الدولہ کا ان کو خطاب ہوا۔یہ واقعہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء کا ہے۔مگر اُس وقت نواب دبیر الدولہ بدستور وزیر تھے۔

اس کے بعد نواب دبیر الدولہ نے استعفا دیا اور بہت سے انقلابات سرکار بادشاہی میں ہوئے۔مگر جو عروج اور رسوخ نواب مختار الدولہ کو سرکار تیمور شاہ اور نواب ممتاز محل میں تھا اس میں کچھ فرق نہیں ہوا۔نواب ممتاز محل کے انتقال کے برس ڈیڑھ برس پہلے کسی بات سے ناراض ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔جب کہ نواب علی نقی خاں نائب تھے۔چند سال وہاں بھی نہایت عروج سے رہے پھر وہاں سے واپس آئے اور دلی میں رہنے لگے۔جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی فتح ہوئی تو چیلوں کے کوچہ میں بعض لوگوں نے فوج انگریزی سے کچھ فساد کیا۔سپاہی مکان میں گھس آئے۔اُس وقت نواب وحیدالدین خاں جو ضعیف ہو گئے تھے نماز عصر پڑھ رہے تھے۔کسی سپاہی نے عین نماز کی حالت میں ان کے گولی ماری اور ان کا انتقال ہو گیا۔

خواجہ زین العابدین

خواجہ زین العابدین احمد ان کے چھوٹے بیٹے نے اپنی تمام زندگی نہایت خوبی اور امیری سے بسر کی اپنے والد کے مرنے کے بعد اُنھوں نے اپنے والد کا خطاب حاصل کرنے کی کچھ پروانہ کی مگر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء کے بہادر شاہ نے ان کو دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کا خطاب عطا کیا اور قبل غدر ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۳ھ کے ان کا انتقال ہوا۔

ان کی زندگی عجیب مختلف شوقوں میں بسر ہوئی۔زمانہ تعلیم کے گذرنے اور اپنے باپ سے علم ہیئت اور ریاضیات کو پورے طور پر پڑھنے کے بعد ان کو گانے اور بین بجانے کا شوق ہوا اور یہ شوق کسی

نہ کسی قدر آخیر عمر تک رہا۔

بین جو ایک نہایت عجیب اور عمدہ باجا ہندوستان کا ہے اُس کو خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور اس کے تونبوں اور ٹھاٹھ میں ایسی ایجادیں کیں تھیں کہ لوگ متعجب ہو گئے تھے۔ ٹھاٹ کے پردوں کے مقامات کی جن سے سُر پیدا ہوتے ہیں ہندسی قاعدہ سے نسبتیں نکالی تھیں اور انھیں نسبتوں سے ڈنڈی کو تقسیم کر کے پردے سے بٹھا دیتے تھے۔

بین میں ٹھاٹ کے پردے موم سے جمائے جائے تھے۔ جب اُنھوں نے اس کی نسبتیں نکالیں تو پیتل کی کمانیوں سے ان کو مقامات معین پر کس دیتے تھے۔ یہ ایک ایسی ایجاد تھی کہ اگر یورپ کے کسی باجے میں اس قسم کی ایجاد ہوتی تو شاید ہمیشہ کو اس کا یہ کمال یاد رہتا۔ ایک زمانہ ایسا آتا تھا کہ انکو بجز ان چیزوں کے شغل کے اور طرف توجہ نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے نامی گویے دھرپت وخیال گانے والے نوکر ہیں۔ بینیں تیار ہو رہی ہیں۔ میر ناصر احمد جو مشہور بین بجانے والے ہمّت خاں اور راگ رس خاں کے نواسوں میں تھے۔ مگر ان کے باپ نہایت صحیح النسب سیّد تھے وہ آتے ہیں اور بین بجتے ہیں اور بین بجانے کے فن کے کمال کو دکھایا جاتا ہے۔

اس زمانے کی بعض مجلسیں یہی قابل یادگار ہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے جانشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشیانہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے گویے آتے تھے۔ دھرپت وخیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد بین بجاتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ جاتے تھے۔ راقم بھی بہت دفعہ ان کے ساتھ اُن جلسوں میں گیا ہے۔ خواجہ محمد نصیر صاحب جو نہایت بزرگ ومقدس تھے اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے۔

اور ایک جلسہ مگر اس جلسہ سے مختلف قسم کا ہر مہینے کی سترھویں کو ہوا کرتا تھا۔ رائے پران کشن ایک معزز رئیس اور نہایت ہی وضع دار اور دولت مند تھے اور اسی زمانہ ایک طوائف جو نہایت خوش آواز اور دھرپت وخیال گانے اور بین بجانے میں بے مثل تھی اس کا نام جتا تھا۔ اس نے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینہ کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا

کرتے تھے۔

مکان نہایت عمدہ فرش وفروش سے آراستہ ہوتا تھا۔ شیشہ آلات سے جو اُس زمانہ میں مروج تھے بہت ہی عمدگی اور خوبصورتی سے بجایا جاتا تھا۔ شہر کے رئیس خصوصاً وہ جن سے رائے پران کشن سے دوستی تھی بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے اور بہادر خاں ستارن جو ستار بجانے میں بے مثل تھا۔ اور میر ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے سب جمع ہوتے تھے۔

بی جتّا کے لئے صدر کے مقابل پائیں سمت میں مسند تکیہ لگتا تھا اور لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اُترتیں اور ان کے پانوں کے زیور کی آواز آتی تو لوگ زیادہ مشتاق ہوتے تھے۔ وہ نہایت متانت اور غرور سے آکر مسند پر بیٹھتی تھیں۔ اوّل دھرپت وخیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں اور پھر اُٹھ کر کوٹھے پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ ان کے گانے بجانے کی نہایت تعریف کرتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے راقم بھی متعدد دفعہ اُن کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔

کبھی اُن کو فن ریاضی سے شوق ہوتا تھا۔ دن رات بجز آلات رصد کے بنانے اور کواکب کے رصد کرنے کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ جو کہ خود بہت بڑے دستکار تھے۔ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ نہایت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اصطرلاب اپنے ہاتھ سے ایسا عمدہ بنایا تھا جو عجائب روزگار سے تھا۔

اسکے سوا بہت سے آلات مثل ذات الحلقین اور ذات الحلق۔ ربع مجیب۔ ربع مقنطر۔ جریب الساعۃ۔ مقیاس الساعۃ افقی وافاقی۔ پرکار تقسیم۔ پرکار متناسبہ اور اسی طرح جر ثقیل کے آلات اور آلات رصد برجندی کے تمام نمونے خود ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ اُن کا وہ کمرہ جس میں یہ آلات رکھے جاتے تھے ایک رصد خانہ معلوم ہوتا تھا۔

کسی زمانہ میں ان کو پتنگ بازی کا شوق ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بجز اس کے اور کسی چیز کا چرچا نہ رہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے پتنگ بنانے کو بھی انھوں نے ایک علمی چیز کر دیا تھا۔ اور ایک رسالہ صنعت

پتنگ میں لکھا تھا اور اقلیدس کی طرح اس کی شکلیں اور اس کی نسبتیں قائم کی تھیں اور اُن کی ہر ایک قسم کی خاصیتیں لکھی تھیں کہ فلاں قسم کا پتنگ اتنی دور جا کر یہ کام کرے گا اور فلاں قسم کا وہ کام کرے گا مگر افسوس ہے کہ وہ رسالہ غدر میں ضائع ہو گیا۔

کسی زمانہ میں ان کو تیر اندازی کا شوق ہوتا تو بجز تیر اندازی اور کمانوں اور تیروں کے بننے اور سہ پہر کو تیر اندازی کے جلسوں کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ جلسے ایسے نہیں ہیں جن کی خوبی اور عمدگی اور شان کو اور ان امرا اور سلاطین کے تزک کو جو تیر اندازی کے جلسوں میں آتے تھے بیان کیا جا سکے۔

تیر اندازی کا فن اُنھوں نے سید محمد متقی خاں راقم کے والد سے جو اس فن میں بے نظیر تھے سیکھا تھا اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے کمانیں اور ہر قسم کے تیر بناتے تھے ان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کمانیں کشمیر کی بنی ہوئی کمانوں سے زیادہ عمدہ سمجھی جاتی تھیں۔ بڑی خوبی ان کمانوں میں یہ تھی کہ برسات میں رخ نہ کرتی تھیں۔ تیر اندازی کے لئے گھر میں تو وہ تیار ہوتا تھا اور تیسرے پہر کو شہر کے اکثر امرا اور رئیس اور بعض سلاطین جمع ہوتے تھے اور نہایت نفیس جلسہ ہر روز ہوا کرتا تھا اور جو صنعت اور خوبی تیر اندازی کی ظاہر ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس زمانہ میں آیا سنگھ ایک تیر انداز تھا جو نہایت کڑی کمان کھینچتا تھا۔ مگر جب ان لوگوں کا جو اس سے نرم کمان کھینچتے تھے۔ تیر زیادہ تو وہ مین کارگر ہوتا تھا تو بڑا لطف ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک پیر مرد مسلمان تھے۔ ان کو تیر اندازی کا بڑا شوق تھا۔ میر الا اللہ ان کا نام پڑ گیا تھا۔ کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت الا اللہ کہا کرتے تھے۔ وہ غریب آدمی تھے۔ سامان تیر اندازی کا ان کو نواب زین العابدین خاں دیتے تھے۔ وہ تیر لگانا بھی اچھا نہیں جانتے تھے۔ مگر تیر اندازی کی مجلس میں وہ سب لوگوں کو ہنسانے اور خوش کرنے والے تھے۔ ایک ذی عزت ہندہ مرصع ساز کو بھی تیر اندازی کا بہت شوق تھا۔ اور تیر لگاتے وقت اللہ غنی کہتا تھا۔ اُس کا نام، اللہ غنی، ہی پڑ گیا تھا۔ ان باتوں کے لکھنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں کیسی عمدہ صحبتیں تھیں۔ اب وہ سب خواب و خیال ہیں۔

آخر میں ان سب چیزوں کا شوق نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کو اور خصوصاً خواجہ ہاشم علی

خاں (۲۳) اپنے بیٹے کو جو بے مثل ذہین اور لائق اور نیکی اور سعادت مندی میں فرشتہ خصلت تھے ریاضیات میں سے کسی کتاب کا سبق پڑھادیتے تھے۔

خواجہ فرید کی اولاد اناث

خواجہ فریدالدین احمد کی تین بیٹیاں تھیں۔ ایک عزیزالنساء بیگم والدہ راقم کی دوسری فاطمہ بیگم اور تیسری فخرالنسا بیگم۔

والدہ سرسیّد

عزیزالنسا بیگم نہایت لائق ذہین۔ قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں میں نے خود گلستان کے چند سبق اُن سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مُجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہونگی۔ مگر ان سُوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔

اُن کی تعلیم اور اُن کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں۔ مُجھ کو یاد ہے۔ کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی۔ میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام وجہ ثبوت جس سے اُس کو فوجداری عدالت سے کافی سزامل سکتی تھی میرے ہاتھ آگئی میرے نفس نے مُجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا۔ کہ اگر تم اس کو معاف کرو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزادلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزادینے والا ہے اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف وناتوان دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم

کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کبھی دور نہیں ہوا۔ اور نہ ہوگا۔ اور جیسے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسے ہی دشمنی کی ہو انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا۔ بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے میرے دل میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔

جس زمانہ میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پُرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا ''اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا دل چاہے چلا جاوے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا، چنانچہ ایک ماما ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی اور اور مجھ کو میرے خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ ''دیکھو تمھاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہونگی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں''۔ اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ ''دیکھنا آپا جی یعنی میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔'' تین دن کے بعد میری خالہ جن کو آپا جان کہا کرتا تھا، میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

ان کی خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں۔ زنانہ مکان کے باہر بطور جلو خانہ کے ایک میدان تھا اور اس کے ایک طرف متعدد کوٹھریاں اور یک درے ملازموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے۔ غیر اور لاوارث بڑھیا عورتوں کو اس میں رکھتی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک لاوارث بڑھیا مسماۃ زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی

بیمار ہوئیں اور زیباً بھی بیمار ہوئی بیماری بھی قریب قریب ایک ہی تھی۔ جو دوا ان کے لئے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زیباً کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ مگر حکیم معالج نے میری والدہ کے لئے ایک نسخہ معجون کا جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ جس قدر تیار ہوا وہ مقدار میں ایک ہی شخص کے لئے چند روز تک کھانے کے لائق تھا۔ میں اس زمانہ میں دلی میں منصف تھا۔ میں اس معجون کو تیار کر کے لے گیا اور کہا کہ یہ اتنے دنوں کی خوراک ہے اس کو استعمال فرمائیے۔ انھوں نے اس کو لے لیا اور اس خیال سے کہ وہ معجون زیباً کے لئے بھی ایسی مفید ہو گی جیسی کہ مجھ کو اور ان کو یقین نہ تھا کہ زیباً کے لئے بھی ایسی معجون تیار کر لی جاوے گی۔ اس لئے خود انھوں نے اس معجون کو نہیں کھایا اور خفیہ خفیہ زیباً کو کھلایا اور اس معجون سے زیباً کی صحت میں بہت ترقی ہوئی اسی کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔ چند روز بعد میں نے اس سے کہا کہ اس معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا ''تمھارے نزدیک بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دیتا''۔ میں متعجب ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ معجون ان کے عوض زیباً نے کھائی اور خدا نے دونوں کو صحت عطا کی۔ ایک کو بحیلہ دوا کے اور ایک کو محض اپنے فضل و کرم سے۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا ہے روپیہ۔ پیسہ۔ گانوں کا یا ملکوں کا غلہ مکانوں کا کرایہ۔ تنخواہ قلعہ کی۔ باغوں کا میوہ سب میں سے بحساب پانچ فی صدی کے خدا کے نام پر علحدہ کر دیتی تھیں۔ اپنی بہنوں اور بھانجیوں پر بھی تاکید کی تھی کہ اسی طرح پانچ فی صدی کے حساب سے خدا کی راہ پر دیا کریں اور جس قدر روپیہ اس طرح پر جمع ہوتا اس کو نہایت عمدگی اور خوبی اور ایک انتظام سے خیرات میں صرف کرتیں۔

اس طرح پر ان کے پاس ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا تھا۔ اور اُس میں سے غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں، امداد کرتیں۔ غریب عورتوں کی جوان لڑکیوں کے نکاح کو دیتی تھیں اور اس طرح پر بہت سی جوان لڑکیوں کا ان کی امداد سے نکاح ہوا ہے۔ نوکری پیشہ یا غریب اور مفلس خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں تھیں اُن کا دوسرا عقد کر دینے کی نصیحت کرتیں اور ان کے نکاح کر دینے کو روپے سے امداد کرتیں۔ وہ عموماً لوگوں کو سمجھاتیں کہ نکاح ثانی نہ کرنا

دوسری چیز ہے مگر نکاح ثانی کو معیوب سمجھنا یا جس نے نکاح ثانی کیا ہے اس کو حقیر و ذلیل سمجھنا سخت گناہ ہے۔

غریب رشتہ داروں کے گھر میں جاتیں اور خفیہ طور پر کسی حیلہ سے ان کی امداد کرتیں بعض رشتہ دار ایسے بھی تھے کہ اُنھوں نے ایسی عورتوں سے شادی کرلی تھی جن سے ملنا معیوب سمجھتے تھے۔ مگر ان کا قول تھا کہ خدا کے حکم سے صلہ رحم سب پر مقدم ہے۔ وہ خود اُن کے گھر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں اور ان کے ساتھ سلوک کرتیں۔

ان کو ہر ایک بات میں خدا پر بہت توکل تھا وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ ''دکھ بیماری میں علاج کرنا۔ دوا دینا صرف ایک حیلہ ہے۔ شفا دینے والا خدا ہے۔ اگر دوا اور حکیموں کے علاج سے لوگ مرا نہ کرتے تو سب لوگ خدا کو بھول جاتے'' وہ کہتی تھیں کہ ''اگر سیتلا کے پوجنے سے لڑکیاں لڑکے سیتلا کی بیماری سے نہ مرتے تو تمام دنیا بجز ان کے جن کو خدا بچاتا کافر ہو جاتی۔''

کبھی کوئی منت و نذر نیاز کسی امر کے لئے انھوں نے نہیں مانی۔ گنڈے تعویز پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع نہ کرتیں اور کہتیں کہ اگر ان لوگوں کو اس سے منع کیا جاوے اور نہ کرنے دیا جاوے اور اتفاق سے وہ امر پیش آجاوے جس کے خوف سے وہ گنڈہ تعویذ کرتے ہیں یا سعادت و نحوست دیکھتے ہیں تو ان کے ایمان میں زیادہ خلل آجاوے گا اور وہ یقین کریں گے کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اور اگر ایسا کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ اُن کا قول تھا کہ ''ہر بات کے لئے صرف خدا سے دعا کی جاوے پھر وہ جو چاہے گا وہ کرے گا''۔

وہ کہتی تھیں کہ ''مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اُس میں بھی خدا کی کچھ حکمت ہوتی ہے۔ مگر بندے اُس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔''

میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی، مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی اور شاہ صاحب کے ہاں اس قسم کی باتوں کا پتہ بھی نہ تھا۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان کے پاس کوئی حاجت لے جاتا تو وہ اسی وقت ہاتھ اٹھاتے اور سب

حاضرین سے کہتے کہ "دعا کرو کہ خدا اس کی آرزو پوری کرے۔" یہی عقیدہ میری والدہ کو بھی مستحکم تھا۔

میری ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈہ پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈہ کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھا دیں گے تو کوئی آفت آوے گی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے پراٹھے اور انڈا پسند کرتے تھے۔ بے تامل ان کو پکوا کر کھلا دیتی تھیں۔

میں جب دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مُجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہوگا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو۔ کبھی پیادہ پا۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اُس کو بناہ سکو" چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب سے بہت دوستی تھی۔ آپس میں بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی ان کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا تو میں اُسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا۔ ہفتہ میں دو روز ان کے پاس جاتا تھا اور وہ بھی وقت معین میں میرے پاس آتے تھے۔ اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا اور ملتا رہا۔ مگر انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک میں

نے اس کا خیال نہ کیا۔ آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ "میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو اس کا کیا سبب ہے۔" میں نے جو بات تھی وہ کہی۔ اُنھوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جہاں دوستی ہے اس کا پورا کرنا چاہئے۔ یہ تمھارا فرض ہے اور اُس دوست کو دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے کیوں زمہ دار ہوتے ہو۔ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔"

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید بڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔

میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی اُس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جاوے نیابت کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے۔ کہ میرا عقیدہ اس زمانہ کے وہابیوں یا اہل حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ گو وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا اُن سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے اور بہت کم اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ سید محمد خاں ان کے بڑے بیٹے نے ستیئیس اڑتیں برس کی عمر میں انتقال کیا۔ میری والدہ اور تمام لوگ چھوٹے بڑے ان کے زمانہ بیماری میں بیمار داری اور علاج معالجہ میں مصروف تھے۔ میری والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں قریب ایک مہینہ کے وہ بیمار رہے۔ آخر کار ایک دن صبح کے وقت انکا انتقال ہو گیا۔ سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ جو رنج و غم ان کو ہوا ہو گا ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ کسی کو نہ ہوا ہوگا بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اُسی حالت میں

انھوں نے کہا کہ: خدا کی مرضی۔ اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اُٹھیں۔ میں اُس زمانہ میں فتح پور سیکری میں منصف تھا۔ اس کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرالی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی (دختر) کی شادی اُسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے۔ اور وہ تمام سامان شادی کا کر چکی تھیں کہ سید محمد خاں کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ دستور ہے اُن لوگوں نے اس لڑکی کی شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن اپنے بڑے بیٹے کے انتقال کے اور ایسے سخت صدمہ کی حالت میں خود اُن رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ ''میں تمھاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا اور جو امر کہ خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم ہرگز شادی کو ملتوی مت کرو۔ اور جبکہ میں خود تمھارے گھر میں آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہ سکتا ہے۔

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال۔ اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق دانشمند اور دور اندیش۔ فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو، کیا اثر پڑتا ہے۔

وہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ ''اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی برائی برابر ہو گئی۔ مگر نیکی ایسی چیز ہے کہ اُس کے بعد نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اُس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی نیک بی بی کو آخیر عمر میں تکلیف پہنچی۔ جس زمانہ میں غدر ہوا میں بجنور میں صدر امین تھا اور میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب عزیز و اقارب دہلی میں۔

وہ زمانہ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ ''انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجاویں گے۔ تم سب

خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے انگریز ان کو کچھ نہیں کہنے کے۔

اُن کو یقین کامل تھا کہ "انگریز بجز اُن کے جنھوں نے فساد کیا ہے کسی کو کچھ تکلیف نہیں دینے کے" جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے۔ مگر وہ اور ان کی ایک بہن جو نابینا تھیں اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ اُن کا خیال غلط نکلا اور جب دہلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا۔ وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اُس کوٹھری میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن اُنھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیئے اس عرصہ میں راقم جو میرٹھ میں آ گیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔

میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ اور اُنھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں تم یہاں کیوں آ گئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ ہم پر جو گذرے گی۔ گذرے گی۔"

میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھئے مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔" اُن کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی مطلق نہیں پیا ہے۔

میں پانی کی تلاش میں نکلا پانی اُس طرف کہیں نہیں ملا۔ کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے پانی نکالا جا سکے۔ ناچار پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی اور پھر اُٹھا نہ گیا۔

مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے۔ دو دن سے پانی نہیں ملا میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا (پانی پی لے) اس نے کپ کپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرادیا۔ اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب پیاسی ہیں ان کے لئے پانی لے جاؤں گی اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔

میں نے کہ ''میرے پاس پانی بہت ہے میں لے آیا ہوں تو پانی پی لے پھر آبخورہ میں پانی دیا۔ اس نے پیا اور لیٹ گئی میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ اُنھوں نے خدا کا شکر کیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اُس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا زیبا لیٹی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے سارے شہر میں باوجودے کہ حکام نے بھی احکام جاری کئے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے مجھ کو دے دی جاوے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

منشی الطاف حسین صاحب سر رشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو میرے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے اور ان کے خاندان اور میرے خاندان سے ارتباطِ قدیمی تھا میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی ہے اور صفرا کی نہایت شدت ہو گئی۔ جو دوا یا غذا دی جاتی تھی وہ قے ہو جاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہو جاتی کبھی شدت ہو جاتی۔ آخر کار اسی مرض میں یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کے اُنھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مگر ان کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر ان کی بیٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بہوئیں جو مختلف مقامات میں چلی گئی تھیں سب ان کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے سب کو صحیح وسالم اور خیر و عافیت سے دیکھ کر نہایت خوشی ظاہر کی تھی۔

اُنھوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔

ایک یہ کہ اُن کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ اُن کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں۔ لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کو بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اُس قدر دنوں کی نمازوں کا حساب کر کر کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا۔ جب کہ دوسرے دن اُنھوں نے قضا کی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ واِنَّا اِلَیہِ راجعون

شخصیات

۱۔خواجہ ابو یعقوب یوسف ہمدانی۔

۲۔رسول شاہ۔

۳۔مولوی محمد حنیف

۴۔علامہ تفضّل حسین خاں۔

۵۔راجہ رام موہن رائے۔

۶۔حکیم احسن اللہ خاں۔

۷۔مولوی کرامت علی۔

۸۔رجب علی۔

۹۔خواجہ محمد نصیر۔

۱۰۔حکیم رستم علی خاں۔

۱۱۔خواجہ وحید الدین۔

۱۲۔نواب زین العابدین خاں۔

۱۳۔میر ناصر احمد۔

۱۴۔ہمت خاں۔

۱۵۔راگ رس خاں۔

۱۶۔حکیم غلام نجف خاں۔

۱۷۔شاہ محمد آفاق۔

۱۸۔خواجہ علاؤ الدین احمد۔

۱۹۔فدا حسین۔

۱۔خواجہ ابو یعقوب یوسف ہمدانی

محمد داراشکوہ، سفینۃ الاولیا میں لکھتا ہے، کنیت ابو یعقوب، اصل ہمدان، شیخ ابو علی فارندی و شیخ ابو اسحق شیرازی کے مرید تھے، شیخ عبدالرشید جونی، اور شیخ سمنانی سے بھی استفادہ کیا تھا اور بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی فیض صحبت حاصل کیا تھا، مذہباً حنفی تھے، ولادت ۴۴۰ھ میں ہوئی اور وفات مرو میں ۵۳۵ھ میں مزار مرو میں ہے ان کے چار خلفاء تھے۔(۱) خواجہ عبداللہ برقی (۲) خواجہ انداقی (۳) خواجہ احمد بسوی (۴) خواجہ عبدالخالق غجدوانی۔ مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی ان کے مرید تھے۔ (ص ۷۵ و ۱۶۷ مطبع نول کشور)۔

مولانا عبدالرحمان جامی نے بھی نفحات الانس میں تقریباً یہی حالات تحریر کئے ہیں، اِلّا یہ کہ شیخ ابو علی فارندی سے ان کی نسبت کو مشکوک لکھا ہے۔

۲۔رسول شاہ

رسول شاہ کا اصل نام سید عبدالرسول تھا، بہادر پور مضاف الور وطن تھا۔ شاہ نعمت اللہ کے مرید تھے جن کے توسط سے ان کا سلسلہ نسبت حضرت شیخ شہاب الدین سہروری تک پہنچتا ہے انہی بزرگ سے ''رسول شاہی'' سلسلہ منسوب ہے۔ اس فرقہ کے فقراء کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلی کا یہ بیان مستحق توجہ ہے:۔

''ان سے ملنا نہیں چاہئے کیونکہ اس ملاقات سے وہ
کدورت حاصل ہوتی ہے جو دنیادار ہنود سے بھی نہیں ہوتی''

ملفوظات عزیزی۔ ص ۹۴

شاہ صاحب کے ایک اور معاصر مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں:۔

''اصلیت ان (رسول شاہ) کی اتنی ہے، کہ ایک بساطی تھا

اس کا کام بگڑ گیا۔لوگوں کا بہت سا قرض اُس کی گردن پر ہو گیا اس لئے وہ جمنا کی طرف بھا گا اور الور پہنچا، ہئیت بدلنے کے لئے داڑھی اور بھوؤں کا صفایا کیا۔ یہاں کے لوگوں کو سادہ پا کر پیر بن بیٹھا، جو کوئی اس کے پاس آتا اس سے بھی یہ کہتا کہ فاقہ کرو اور اس کو بھوکا رکھتا جب وہ شخص جاں بلب ہو جاتا تو کوٹی ہوئی بھنگ پانی میں بھگو کر اور کپڑے میں چھان کر اس کا فضلہ کھانے کو اور وہی پانی پینے کو دیتا، بھنگ کا اثر بھوک میں اور زیادہ ہوتا ہے رفتہ رفتہ وہ شخص دماغ کی خشکی سے دیوانہ ہو جاتا اور لوگ رسول شاہ کی صحبت کے اثر سے مجذوب سمجھنے لگتے۔ص ۳۰ علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) (مرتبہ محمد ایوب قادری ایم،اے)۔

سر سیّد نے آثار الصنادید کے باب چہارم (تذکرہ اہلِ دہلی)۔مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی) میں ان کا سالِ وفات ۱۱ھ لکھا ہے، مرتب نے بھی حاشیہ میں اس کی صحت بھی نہیں کی۔ غالبًا ۱۲۱۱ھ ہے۔

۳۔ مولوی محمد حنیف

اصل نام مظفر حسین تھا، میرٹھ کے رہنے والے تھے، اور ایک صاحب ثروت خاندان کے فرد تھے ابتداء تدریس میں مشغول رہتے تھے بعد میں رسول شاہ کے مرید ہو کر اُنھیں کے پاس جا رہے اور وہیں (الور میں) انتقال کیا ان کا سن رحلت بھی تذکرہ اہل دہلی (ص ۳۹) میں ۱۲ھ لکھا ہے اور یہاں بھی مرتب نے تصحیح نہیں کی، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے ۱۲۱۷ھ سن رحلت لکھا ہے (راجگان ہند جلد اوّل، ص ۳۶۷ بحوالہ علم وعمل، ص ۱۳)

مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں:۔

کچھ عرصہ بعد ایک شخص جو مولوی حنیف کے نام سے
مشہور ہے اور کچھ شوقین مزاج بھی ہے اس (رسول شاہ) سے
آملا اور رسول شاہ کے کام کی رونق بڑھادی، مولوی حنیف
بھنگ کی تعریف کے علاوہ لہلہ فریب کلمات لوگوں سے
کہتا اور لوگ یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک مولوی اس فقیر کا تابع
ہے بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی باتوں کا یقین کرلیتے اور
اندھا دھند گمراہی کے گڑھے میں گرتے (ص ۳۰ علم و عمل)

۴۔علامہ تفضّل حسین خاں

عہد آخر کے ایک باکمال بزرگ گذرے ہیں، ریاضیات میں بطور خاص اُنھیں کمال حاصل تھا، ہئیت و ہندسہ میں جدید معلومات سے بھی بہرہ ور تھے، جدید اور مغربی السنہ و فنون کے علماء کا ایک گروہ تو ہمارے یہاں وہ ہے جس نے مدارس جدید (دلی کالج وغیرہ) میں باقاعدہ تعلم حاصل کی تھی۔ لیکن ایک گروہ تھا جس نے انفرادی طور تحصیل کی تھی، علامہ تفضّل حسین خاں دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے وہ سیال کوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر میں دہلی پہنچے مولوی وجیہہ الدین (شاگرد ملا نظام الدین سہالوی) مرزا محمد علی ابن مرزا خیر اللہ مہندس سے تحصیل علوم کی، اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے والد (اسد اللہ بن کرم اللہ) کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ وہاں ملا حسن لکھنوی سے استفادہ کیا، تکمیل و فراغ کے بعد شجاع الدولہ سے وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے سعادت علی خاں کا اتالیق مقرر کر کے الہ آباد بھیج دیا، الہ آباد سے بنارس پہنچے اور شیخ علی حزیں سے مستفید ہوئے۔ وہاں سے کلکتہ چلے گئے کلکتہ سے جنرل پامر کے ساتھ ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ آئے۔ ۷۔۱۷۸۸ء میں آصف الدولہ نے اپنا سفیر (وکیل) بنا کر کلکتہ بھیج دیا، ۶۔۱۷۹۵ء میں لکھنؤ بلا کر اپنا وزیر بنا دیا اور آصف الدولہ کی حیات تک وہ اس منصب پر رہے ۱۷۹۸ء میں جب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے تو اُنھوں نے علامہ کو کلکتہ روانہ

کر دیا۔ اور وعدہ کیا کہ سند سفارت بعد میں بھیج دوں گا مگر اصل میں وہ علامہ کو اس طرح ٹالنا چاہتے تھے چنانچہ سند نہیں بھیجی جس کو علامہ نے بہت محسوس کیا اور ان کے جسم میں خلط سودا کی کثرت ہوگئی اور نتیجۃً مالی خولیا کے آثار و علامات پیدا ہو گئے بعد میں فالج بھی ہو گیا، حصول صحت کی غرض سے عازم لکھنؤ ہوئے مگر راستہ ہی میں بمقام ہزاری باغ (بہار) ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں وصال ہو گیا۔

علامہ لاطینی اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ یہ واقفیت اُنھوں نے کلکتہ میں حاصل کی تھی آپ کی تصانیف و شروح میں سے۔

۱۔ شرح مخروطات ایلوبنوس

۲۔ شرح مخروطات دیونبال

۳۔ شرح مخروطات سمسن

۴،۵۔ جبر و مقالہ پر دو رسالے

اور درسی کتب پر تعلیقات ہیں۔

ترجمہ تذکرہ علماء ہند از محمد ایوب قادری ایم، اے۔ ص ۱۳۹ الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند۔ ص ۲۷۱ و ص ۲۷۶ نزہتہ الخواطر جز سابع رود کوثر۔ ص ۶۳۰ (حوالہ ہائے بنجوم اسماء و تحفہ العالم و قیصر التواریخ)۔

۵۔ راجہ رام موہن رائے

منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔ یہ ستودہ صفات قوم کا برہمن تھا۔ اور ایک شریف خاندان میں ۱۷۸۰ء میں بردوان میں پیدا ہوا اس کے باپ دادا دونوں بنگال کی عمدہ خدمتیں رکھتے تھے اس لئے اُنھوں نے فارسی، عربی کی تعلیم پائی اور بہت غور و خوص سے قرآن شریف سے استفادہ کیا جس سے اس کے دل میں توحید الٰہی کا جوش اُٹھا۔ بت پرستی سے نفرت پیدا ہوئی، وہ انگریزی سرکار کے نوکر ہوئے اور بندریج ترقی پاتے گئے۔ سنسکرت اور انگریزی زبان میں استعداد بہم پہنچائی پھر ۱۸۱۴ء میں ترک

ملازمت کر کے کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔۔۔ وید اور ویدانت کو سنسکرت اور بنگالی اور انگریزی میں چھپوایا۔۔۔ اور فقط دریوزہ گری علم اور آموزش و دانش کے واسطے انگلستان کی سیر کا ارادہ کیا اور بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کی مختاری کا عہدہ قبول کیا ۱۸۳۰ء میں ولایت پہنچا۔۔۔ برسٹول میں ۱۸۳۳ء میں روحِ مقدس ان کی جنت کو رخصت ہوئی۔" ص ۴۸۲ تاریخ ہند (عہد انگلشیہ)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔ اکبر شاہ نے رام موہن رائے کو راجا کا خطاب دیا اور پنا سفیر بنا کے انگلینڈ بھیجا۔ راجہ صاحب کی انگلش سوسائٹی میں ان کے علم اور لیاقت کی وجہ سے بڑی قدر شناسی ہوئی مگر اس کی سفارت کی رتی برابر بھی قدر و حرمت نہیں ہوئی ہوا اپنے کام میں بے نیل و مرام رہا، ص ۳۸۴

راجا نے پھلواری شریف (پٹنہ، بہار، بھارت) میں ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، ص ۱۹ آثارات پھلواری۔

راجا نے ایک گھڑی ساز ڈیوڈ ہیر DEVIDHARE کی شرکت سے ۱۸۱۶ء میں مغربی علوم والسنہ کی ایک درسگاہ جاری کی تھی، جسے "ہندو ودیالیہ" "ہندو کالج" اور "اینگلو انڈین کالج" کہتے ہیں۔ یہ سب سے پہلی مغربی طرز کی درسگاہ تھی جو ملک میں جاری ہوئی اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں جے نرائن کالج (بنارس) ۱۸۲۱ء میں پونا ہندو کالج (پونا) ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج (آگرہ) ۱۸۲۵ء میں دلی کالج (دہلی) جاری ہوئے۔" ص ۲۱ تاریخ مدرسۂ عالیہ۔

۶۔ حکیم احسن اللہ خاں

برصغیر میں ۱۹ویں صدی عیسوی کی ایک اہم مسلم شخصیت تھے فاضل و کامل اور معروف و ممتاز طبیب و معالج، تیموری دربار کے ذی اثر و معتمد امیر اور تمثیل جہاد حریت کے ایک خصوصی کردار تھے، شجرۂ نسب جناب صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور سلسلہ سند حکیم ذکاء اللہ خاں کے توسط سے حکیم مسیحا خاں تک، عملی زندگی کا آغاز فیروز پور جھرکہ اور جھجھر کے درباروں سے کیا اور اس کے بعد مرکز کی طرف متوجہ ہوئے تا آں کہ لال قلعہ کی سیاست پر حاوی ہو گئے اور تقریباً ۲۲ سال دہلی کے دو آخری فرماں

رواؤں کے دل ودماغ پر چھائے رہے اکبر شاہ ثانی نے انھیں ''عمدۃ الملک حاذق الزمان'' کا خطاب دیا اور بہادر شاہ ظفر نے ''احترام الدولہ ثابت جنگ'' کا ۱۸۴۲ء میں سرسید کو بہادر شاہ نے ''جوادالدولہ عارف جنگ'' کا خطاب دیا تھا اس کی تحریک حکیم صاحب نے ہی کی تھی، غالب اور مومن سے بھی خصوصی تعلقات تھے۔ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ نے غالب کو تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی تھی اس کا مواد فراہم کرنے کی ذمہ داری حکیم صاحب کے سپرد تھی، غالب کی کلیات نثر فارسی، ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' میں متعدد خطوط حکیم صاحب کے نام ہیں، دوسرے حضرات کے نام کے خطوط میں بھی حکیم صاحب کا تذکرہ ہے۔ مومن کا دیوان فارسی اور انشاء مومن (مجموعۂ مکاتیب فارسی) حکیم صاحب ہی نے ۱۸۵۵ء میں مرتب کر کے شائع کئے تھے، انشاء مومن کے بیشتر خطوط حکیم صاحب کے نام ہیں، دو خط حکیم صاحب کی والدہ کے نام ہیں، جن سے ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان ہی خطوط کی بناء پر بعض مورخ یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ حکیم صاحب اور مومن کے پھوپی زاد بھائی تھے، حالانکہ یہ غلط ہے۔

حکیم صاحب نے مراۃ الاشباہ کے نام سے فرماں روایانِ ہند کے حالات میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

میرے پاس حکیم صاحب کی ایک ضخیم بیاض مجربات ومعمولات ہے جو اُنھوں نے اپنے عزیز شاگرد اور میرے پردادا مولوی حکیم سید دائم علی عظیم آبادی ثم تونکی کو عطا فرمائی تھی، حکیم صاحب کے شاگرد اور نسبتی بھائی غلام نجف خاں میرے دادا حکیم سید برکات احمد کے استاد تھے، ان نسبتوں کے باوصف حق یہ ہے کہ سن ستاون کے ہنگامے میں حکیم صاحب نے حیرت ناک حد تک قابل نفرین کردار کیا، بہادر شاہ ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے، لیکن حکیم صاحب انھیں غلط مشورے دیتے رہے۔ غلط یقین دہانی کرتے رہے اور ادھر انگریزوں اور رجب علی جیسے ''کمپنی پرستوں'' سے ملے رہے اور ہر کام انگریزوں کے مفید مطلب کرتے رہے حد یہ ہے کہ عدالت (فوجی کمیشن) کے سامنے بہادر شاہ کے خلاف بیان دے کر محسن کشی کا داغ بھی اپنے دامن پر لگالیا، ان خدمات کے صلے میں دو سو روپیہ ماہانہ

کی پنشن مقرر ہوئی

ایماں فروختند وچہ ارزاں فروختند!

۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تذکرۂ اہل دہلی، ص ۴۶ الثورۃ الہندیہ۔۔۔ بہادر شاہ کا روزنامچہ، ص ۱۳۲ سرطاس مٹکاف کی ڈائری، ص ۵۲ واقعات دار الحکومت دہلی، ص ۲۰۰ تا ۲۸۹ حکیم احسن اللہ خاں کا روزنامچہ (انگریزی) وغیرہ۔

۷۔ مولوی کرامت علی

''خلف الرشید ہیں مولوی حیات علی خوش نویس رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاگرد رشید ہیں مولانا فضل امام صاحب کے فضل وکمال ان کا حد تقریر اور حیطۂ تحریر سے زیادہ ہے استحضار اس مرتبہ کو پہنچا ہے کہ حصولی ان کے ذہن میں حکم حضوری کا رکھتا ہے عرصہ چند سال کا ہوا شہر شاہ جہاں آباد کو تلاش معاش کی تقریب سے چھوڑا اور حیدر آباد کی طرف راہی ہوئے، چونکہ السفر وسیلۃ الظفر حدیث مشہور ہے۔ گردشِ فلک نے وہاں ان سے موافقت کی اور بالفعل ہزار روپیہ ماہانہ کے منصب سے سرفراز ہیں اس نواح میں مع قبائل وعشائر کے گزر کرتے ہیں۔ نظم ونثر اُن کا کچھ راقم کو بہم نہیں پہنچا۔'' سرسید: تذکرۂ اہل دہلی، ص ۹۸

''علوم شرعیہ وادبیہ کی طرف زیادہ متوجہ ہیں اگرچہ کسی فن سے خالی نہیں۔ خوش نویس اور زود رقم میں نے ان جیسا آج تک نہیں دیکھا، اگر کچھ مانع نہیں آیا تو ممکن ہے بہت کچھ ترقی کر جائیں۔ ہر طرح کے علوم حاصل کئے ہیں۔ تعلیم وتعلیم کا رویہ زیادہ تر خاندان عزیزیہ کے طرز پر ہے''۔۔۔ عبد القادر: علم وعمل، ص ۲۵۹

مولوی کرامت علی کی ایک کتاب سیرت محمدیہ ضخامت ج ۶۰۰ سو صفحات حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

۸۔ رجب علی

رجب علی نے نوراحمد چشتی کو "تحققات چشتی" میں درج کرنے کے لئے جو حالات خود لکھ کر دیئے تھے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ولادت ۱۸۰۶ء بمقام تلونڈی (لدھیانہ) ۱۸۱۷ء میں وہاں سے خاندان جگراؤں منتقل ہوگیا ۱۸۱۸ء میں طلب علم کے لئے لاہور پہنچا طب کی تعلیم حکیم سید خیر شاہ لاہوری تلمیذ حکیم اعلیٰ اور مذہب امامیہ کی تعلیم ملا مہدی خطائی سے حاصل کی ۱۸۲۵ء میں دلی کالج میں داخل ہوا تکمیل کے بعد وہیں مدرس ریاضی ہوگیا ۱۸۳۰ء میں مدرسہ کا تعلق ترک کر کے ہوشنگ آباد پہنچا وہاں سے بھوپال آیا اور تحریر فتاویٰ شرعیہ اور امور محکمۂ گورنری کے لیئے مقرر رہا۔ تقریباً تین سال وہاں رہا۔ اس زمانے میں عبداللہ بغدادی سے تسنن و تشیع پر مباحثہ کیا ۱۸۳۳ء میں بھوپال سے جگراوں واپس آیا اور سردار فتح سنگھ کا مصاحب ہوگیا چار ماہ یہاں رہا پھر انبالہ میں ۱۸۳۴ء میں جان رسل کلارک کا منشی ہوگیا ۱۸۵۳ء میں جگراوں میں جاگیر ملی پھر ہنری لارنس کے ساتھ راجپوتانہ کا دورہ کیا۔ واپسی میں دہلی میں مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سے مولوی صدرالدین آزردہ کے روبرو مناظرہ کیا ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں کمانڈر انچیف کا میر منشی مقرر رہا اور جو خدمات انجام دیں ان کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ اور جاگیر اور خطاب "ارسطو جاہ" عطا ہوا ۱۸۴۴ء میں مہم لاہور (ہنگامۂ گاؤکشی کے سلسلے میں) خان بہادری کا خطاب مل چکا تھا۔ ۲۔ ۱۸۶۱ء میں حج و زیارت کے لئے گیا۔ (تذکرۂ روساء پنجاب، ص ۳۳۹ بحوالہ بہادر شاہ ظفر، ص ۱۲۴۹) ۱۸۲۹ء میں انتقال ہوا۔

کمپنی کو استیلاء ہند کی مہم میں جو ذہین و فعال ہندوستانی دستیاب ہوگئے تھے اور جنہوں نے ہر نازک موقع پر بڑے اخلاص وانہماک سے کمپنی کی خدمات انجام دیں تھیں ان میں رجب علی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اس لئے کہ اس نے بڑی کٹھن گھڑی اور فیصلہ کن ساعت میں وطن دشمنی، قوم کشی اور اقتدار پرستی کا مظاہرہ کیا اور جس کا اعتراف اس دور کے متعدد انگریزوں نے واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔

یہ تھے خواجہ فرید الدین کے خلیفہ اور تلمیذ رشید!

مگر تعجب ہے کہ خود رجب علی نے اپنی مندرجہ بالا داستان حیات میں اس تلمذ کا ذکر نہیں کیا۔

۹۔ خواجہ محمد نصیر

خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور میر کلو صاحب اکبر آبادی کے فرزند تھے ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں ولادت ہوئی۔ دس برس کی عمر میں خواجہ صاحب سے بیعت ہوئے۔ ریاضیات میں بہت دخل تھا۔ موسیقی خوب جانتے تھے۔ ''تال'' اور ''حساب'' میں صاحب تصانیف تھے مشہور شاعر خواجہ میر اثر سے فیض باطن حاصل کیا

خواجہ صاحب میر (فرزند خواجہ میر درد) کے بعد ان کے جانشین ہوئے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ رنج تخلص تھا، ایک شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھی نہیں حالت یہ خدائی میں کسی کی
ہے طور جدا اپنا جدائی میں کسی کی!

۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں وفات پائی، تذکرہ اہل دہلی، ص ۲۹

۱۰۔ حکیم رستم علی خاں

طب میں مہارت معقول رکھتے ہیں اور مریض ان کے ہاتھ سے شفا پاتے ہیں اور کتب فارسیہ کو بھی بہت تحقیق سے پڑھاتے ہیں غرض کہ عالم مستعد اور فاضل اجل ہیں۔ بالفعل خلعت و قائع نگاری پر حضرت بادشاہ جم جاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ، وسلطانہ، کی سرکار میں مامور ہیں اور خطاب ''مصلح الدولہ حکیم محمد رستم علی خاں بہادر'' سے ممتاز، راقم (سرسید) سے بھی رابطۂ محبت بکمال رکھتے ہیں انشاء نظم ونثر کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں مگر اخبار سلطانی ہر ہفتہ اُن کی نثر طبع زاد کا نمونہ

ہے۔" تذکرہ اہل دہلی، ص ۱۰۲

۱۱۔ خواجہ وحید الدین خاں

مولوی عبدالقادر رام پوری اپنے وقائع میں لکھتے ہیں۔ "خواجہ وحید الدین خاں پسر خواجہ فریدالدین خاں دبیرالدولہ ایک مدّت تک جنرل آکٹرلونی صاحب کا مصاحب خاص رہا۔ ملکۂ علم جناب عصمت مآب رحیم النساء بیگم کی مہربانی پر گزر کرتا تھا" ص ۲۵۹ علم و عمل۔

"۱۹/ مارچ ۱۸۴۷ء کو مختار الدولہ خوجہ وحید الدین خاں صاحب کو خلعت پنج پارچہ اور رقم جواہر عطا ہوا" بہادر شاہ کا روزنامچہ مرتبہ خواجہ حسن نظامی

۱۲۔ نوب زین العابدین خاں

خواجہ حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں۔ "نواب زین العابدین خاں ۔۔۔ فنون ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۱۲۵۲ھ میں جب طالب علمی کے ارادے سے میرا دلی جانا ہوا تو اس وقت وہ زندہ تھے اور دلی میں ان کی ریاضی دانی خاص کر موسیقی کے علم و عمل میں ان کی بڑی شہرت تھی۔" ص ۱۸

مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں: "جنرل (آکٹرلونی) کا مشیر خاص تھا، زین العابدین امیروں کی خدمت کا خاص سلیقہ رکھتا تھا اور جس سے چاہتا تھا بڑی خوبی سے تعلقات پیدا کر لیتا تھا اس وجہ سے جنرل نے اس جوان کو اسٹور صاحب کا منشی کر دیا تھا، مرد خوش رو، باادب، بزم صاحب سلیقہ زباں داں، حفظ مرتب سے خبردار اور نوشت وخواند میں ماہر جو کوئی اس کے ساتھ مروت سے پیش آتا اور اس کے باپ کے مرتبہ لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ برتاؤ کرتا تو وہ ایسے شخص سے ہمیشہ خوش رہتا تھا۔" ص ۱۹۸ علم و عمل۔

سرسید نے خوش نویسیوں کے زمرہ میں زین العابدین خاں کے بیٹے خواجہ امام الدین خاں کا ذکر کیا ہے، دوسرے بیٹے خواجہ شریف الدین احمد خاں تھے جن کے بیٹے خواجہ مصلح الدین مالک مصلح

المطابع دہلی تھے، تیسرے بیٹے خواجہ ہاشم علی خاں کا ذکر خود سرسید نے اسی کتاب میں کیا ہے۔

۱۳۔ میر ناصر احمد

والد سید تھے مگر نانا ایک مشہور گویا ہمت خاں تھا، اس سے فن موسیقی کی تعلیم و تربیت حاصل کی بین، (ایک قسم کا ساز) بجانے میں کمال حاصل کیا، عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر کیا آخر میں اودھ کی طرف چلا گیا تھا۔" آثار الصنادید، ص ۱۲۴

۱۴۔ ہمّت خاں

بارید اس نامی گویئے کا شاگرد تھا، دھرپد بجانے میں ماہر تھا، عہدِ زوال کے اکثر گرفتاران طاوس و رباب امراء نے اس کی بڑی بڑی تنخواہوں کی پیش کش کی مگر اس نے دہلی سے قدم باہر نہیں نکالا، آثار کی تالیف ۱۸۴۷ء سے چند سال پہلے راہی فنا ہوا، مولوی عبد القادر لکھتے ہیں: رات میں پوریا اور ہمیر، (دوراگ) کا گلے سے نکالنا مشکل ہے۔ لیکن ایک محفل میں موجود تھا اس میں ہمت خاں نے خوب ادا کیا۔ آثار الصنادید، ص ۱۲۳ علم و عمل، ص ۳۰۴

۱۵۔ راگ رس خاں

فن بین نوازی میں یکتائے روزگار و یگانہ شہر و دیار تھا۔۔۔۔ چند سال گذرے کہ عالم فانی سے عالم باقی کو راہی ہوا، ص ۱۲۳ آثار الصنادید۔

۱۶۔ حکیم غلام نجف خاں

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں ابن حافظ مسیح الدین خاں شیخو پوری، ۱۹ ویں صدی میں ایک

عالی مرتبت، یگانۂ عصر اور فقید المثیل طبیب تھے، حکیم صاحب نسلاً فاروقی تھے، جہاں گیر و شاہ جہاں کے عہد کے مشہور امیر اور ''تحریک تجدید'' کے ممتاز رکن شیخ فرید (محتشم خاں) اور نواب قطب الدین خاں (صوبہ دار بنگال واڑیسہ) آپ کے اجداد میں سے تھے، بدایوں کے قریب شیخو پور نامی آبادی کی بنا شیخ فرید نے ڈالی تھی۔

فن طب میں آپ کا سلسلہ اسنادیوں ہے، حکیم غلام نجف خاں از حکیم صادق علی خاں از حکیم شریف خاں از حکیم اکمل خاں از معتمد الملک علوی خاں از حکیم ہادی علوی شیرازی از مرزا محمد نقی موسوی از اطباء خوزو طبرستان از اطباء حران از ابوالطب بقراط از اسقی بیوس از حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام۔

حکیم غلام نجف خاں نے اپنے نسبتی بھائی احترام الدولہ عمدۃ الحکماء حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر سے بھی علم و عمل طب میں استفادہ کیا تھا۔اس لئے ان کے واسطے سے سلسلہ سندیوں ہے۔حکیم غلام نجف خاں از حکیم احسن اللہ خاں از حکیم ذکاء اللہ خاں از والد خود حکیم الحق خاں از والد خود حکیم اسماعیل خاں مخاطب بہ بقاخاں اصغراز والد خود حکیم بقاخاں اعظم از والد خود حکیم عبد السلام خاں از والد خود حکیم حبیب اللہ خاں از والد خود حکیم ارشد خاں از والد خود حکیم مسیحا خاں۔

حکیم صاحب ۵ برس کی عمر میں شیخو پور سے دہلی آئے اور درسی علوم کی تکمیل کے بعد حکیم صادق علی خاں اور حکیم احسن اللہ خاں سے طب کے علم و عمل کی تعلیم و تربیت حاصل کی، ۱۸۳۷ء کے بعد بہادر شاہ نے عضد الدولہ کا خطاب دیا اور ۱۸۴۷ء سے پہلے کمپنی کی طرف سے بحیثیت طبیب شہر مامور ہوئے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں وطن چلے گئے تھے، امن ہونے پر پھر دہلی آرہے۔

سید محمد خاں بہادر مالک سید المطابع سے برادرانہ تعلقات تھے، اس لئے سرسید ان کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتے تھے، ۱۸۶۹ء میں جب سرسید انگلستان جانے لگے تو حکیم صاحب نے سید حامد کے ذریعہ انھیں ایک خط لکھا تھا جس میں الحادو آزاد خیالی کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور نصیحت کی تھی، سرسید نے انگلستان پہنچ کر اس کا جواب دیا تھا، (حیات جاوید، ص ۱۴۳ مکتوبات سرسید، ص ۳۷)

حکیم صاحب کے غالب سے بڑے گہرے روابط تھے، غالب ان کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے حکیم صاحب بھی ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ کبھی شعر کہتے تو غالب سے اصلاح بھی لیتے تھے ''عود ہندی'' میں حکیم صاحب کے نام غالب کے ۲۳ مکتوبات ہیں۔ ''اردوء معلیٰ'' کے بہت سے مکتوبات میں ان کا تذکرہ ہے۔

میرے پاس حکیم صاحب کی کئی نایاب تحریر میں محفوظ ہیں۔ (۱) رسالہ طریق دادن ماء الجبن (۲) رسالہ دستور علاج عینن (اس رسالہ میں وہ ادویہ منضبط کی ہیں جن سے حکیم احسن اللہ خان نے بہادر شاہ کے بعض عوارض کا ازالہ کیا تھا) (۳) ایک تحریر میں حکیم احسن اللہ خاں کے خاص خاص اور معرکہ آراء معالجات کی حکایات درج کی ہیں۔

حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم ظہیر الدین خاں تھے، غالب ان سے بے حد محبت کرتے ''اردوءِ معلّے'' میں ان کے نام غالب کا ایک خط ہے اور ''عود ہندی'' میں ان کی طرف سے ان کے چچا کے نام ایک خط ہے، حکیم ظہیر الدین خاں، حکیم محمود خاں کے معاصر تھے، دہلی میں ان کا مطب خاص و عوام کا مرجع تھا۔

حکیم ظہیر الدین خاں کے صاحبزادے حکیم رضی الدین خاں تھے۔ جنھیں بریطانوی حکومت نے ''شفاالملک'' اور ''خان بہادر'' کے خطابات دیئے تھے۔ حکیم رضی الدین خاں نے اپنے جدمکرم کے علاوہ میرے جد امجد حکیم سید برکات احمد سے بھی تحصیل علوم کی تھی، حکیم رضی الدین خان کے حکیم اجمل خاں سے طب و سیاست دونوں میدانوں میں معرکہ رہے مگر اشراف وثقات اختلافات میں بھی چند حدود اور کچھ قیود کے پابند ہوتے تھے۔

حکیم رضی الدین خاں کے صاحبزادے حکیم ناصر الدین احمد خاں بھی اپنے وقت میں دہلی کی محترم و مقتنم شخصیت تھے، اُن کی آن بان، پابندی وضع، وسعت ظرف، شان وقار اور ادائے سادگی کو دیکھ کران کے اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، برسوں دہلی میں داد مداوا دیتے رہے تا آں کہ ان کا شہرہ دکن تک پہنچا اور پھر سلطان دکن کے معالج خاص ہو کر خود بھی دکن پہنچ گئے۔ سقوط دکن کے بعد پھر دہلی

واپس تشریف لے آئے تھے اور صدر ''جمہوریہ ہند'' کے معالج ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں رحلت فرما گئے۔

حکیم ناصرالدین احمد خاں مرحوم پر اس دودمان گرامی سے طبابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، ہائے!

دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے

۱۷۔ شاہ محمد آفاق

''آپ کے کمالات اور مجاہدہ اور زہد اور مکاشفہ تمام عالم میں مشہور ہیں، آپ بھی اس زمانے کے بڑے ولی اللھوں میں سے تھے، نسبت باطنی اس قدر قوی تھی کہ بڑے بڑے صاحب نسبت اس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے مقامات فقیری بہت صاف تھے۔ نسبت الی اللہ بہت درست تھی، پیروی سنت رسول مقبول ﷺ نہایت مدنظر رکھتے تھے، مسکینی اور شکستگی بدرجۂ کمال حاصل تھی، اپنے تئیں بھی مذل اور نقش ونگار دیوار تصور فرمایا کرتے تھے، نسب آپ کا بھی حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچا ہے اور آپ بھی حضرت مجدد کی اولاد میں ہیں، حضرت خواجہ ضیاءالدین صاحب سے کہ بڑے زبردست فقیر تھے سلسلہ مجددیہ میں آپ نے بیعت کی تھی اور کمال مدارج حاصل کر کے اجازت پیری ومریدی کی حاصل کی تھی اور اپنے پیر کے انتقال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور ان کے اشعار سے آپ کا سلسلہ بخوبی معلوم ہوگا۔

هادی آفاق و انفس مثل اصحاب نبی　　آں ضیاءاللہ زبیر ونقش بند متقی
خواجہ معصوم است واحمد خواجہ باقی خواجگی　　خواجہ درویش ومحمد زاہد اصرار ولی
خواجہ یعقوب بہاءالدین دگر پیر کلال　　خواجہ بابا داں دگر میر علی راتنی
خواجہ محمود است عارف خواجہ عبدالخالق است　　خواجہ یوسف بعد شیخ فارمد آں بوعلی
بوالحسن پس بایزید و جعفر صادق بود

قاسم وسلماں ابوبکر ورسول ہاشمی

اور علاوہ اس کے اور سب سلسلوں میں اجازت پیری اور مریدی کی حاصل تھی آخر کو یہی مضمون صادق آیا کہ

نفسِ فنا تھا سو فنا ہو گیا

یعنی محرم ۱۲۵۱ھ کی ساتویں کو بدھ کے دن نماز مغرب کے بعد آپ نے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی

انّا للّٰہِ وانّا اِلَیہِ راجعون

جمعرات کے دن آپ کو مغل پورہ میں دفن کیا، خواجہ بہاء الدین صاحب نے جو بڑے بیٹے خواجہ علاء الدین صاحب کے ہیں یہ شعر تاریخ وفات میں نظم کیا۔

از سر، یاس گفت اہل جہاں

شاہ آفاق رفت از دنیا

ص ۲۱ و ۳۲ تذکرہ اہل دہلی، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۶۰ھ میں ہوئی اور وفات ۱۲۵۱ھ میں تکمیل سلوک حضرت خواجہ ضیاء اللہ سے کی تھی اور ان کے وصال کے بعد مدت دراز تک خواجہ میر درد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض صحبت حاصل کیا آپ کے مسترشدین میں زمان شاہ والی کابل اور مولٰینا فضل رحمٰن گنج مرد آبادی وغیرہ ہم تھے، شاہ غلام علی دہلوی نے اسیر المرشدین میں ان کا ذکر خیر فرمایا ہے۔ ’’شہرۂ آفاق۔‘‘ از نواب نورالحسن خاں لکھنوی بھوپالی، ص ۷ و ۸ ارشاد رحمانی از مولانا محمد علی مونگیری، ص ۲۶۔ اسرار محبت از نواب نورالحسن خان، ص ۳۔ ’’تذکرہ فضل رحمٰن‘‘ از ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۲ و ۲۳

۱۸۔ خواجہ علاء الدین احمد

آپ شاہ آفاق صاحب کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہیں اور حقیقت میں اپنے پیر کی نشانی ہیں

اس زمانے میں ایسے لوگوں کا ہونا مغتنمات سے ہے ایسے لوگ کا ہے کو پیدا ہوتے ہیں۔ تمام عمر فقیری میں صرف کی اور دنیا مافیہا سے خبر نہ رکھی سچ ہے کہ السعید ین سعد فی بطن اُمہ، چھٹ پن سے آپ کو فقیری کا شوق تھا، سولہ برس کی عمر میں بیعت کی اور طرح طرح کے زہد اور مجاہدہ کیئے اور اپنے پیر کی خدمت میں ہمیشہ سفر اور حضر میں حاضر رہے آپ کا نسب حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے ملتا ہے توکل علی اللہ اور عشق رسول اللہ ہر وقت آپ کے برتاؤ میں ہے، عالم جوانی میں حج خانہ کعبہ کا ادا کیا اور زیارت روضہ منورہ رسول مقبول ﷺ حاصل کی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیب کرے آمین! یارب العالمین! اب سن شریف آپ کا نوے برس کے قریب ہے انکھوں سے معذور ہیں اور پاوں اُٹھ نہیں سکتے طاقت طاق ہے مگر ہر دم شغل جاری ہے اور صوم وصلوٰۃ قائم سبحان اللہ کیا لوگ ہیں کہ کسی حالت میں اپنے معبود کی یاد سے غافل نہیں، غور کرو کہ جس شخص نے اپنا لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپا صرف اللہ کی یاد میں صرف کیا ہو اُس کو کیا علو مدارج حاصل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سلامت رکھے۔ ص ۲۲ تذکرہ اہل دہلی۔

۱۹۔ فدا حسین

اصل نام خواجہ نجیب الدین احمد تھا، خواجہ فرید الدین کے حقیقی بھائی تھے۔ سر سید نے تذکرہ اہل دہلی میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"اٹھارہ برس کی عمر میں فقیری اختیار کی، بیس برس الور میں اپنے پیر کے پاس رہے، پیر کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ پھر بسبب بعض سوانح" کے دلی آگئے۔ مگر الور کے راجہ کی دعوت پر دوبارہ الور پہنچے وہاں ۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے (چند فارسی اشعار بھی نقل کیئے ہیں) تذکرہ اہل دہلی، ص ۱۴۱ و ۱۴۰ امیر شاہ خاں، سر سید کے استاد مولانا فیض الحسن سہارن پوری وغیرہ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ فدا حسین سر سید کے نانا کا بھائی اور نہایت بددین صوفی تھا، جب شاہ اسماعیل شہید کے وعظوں کا زور شور تھا تو اس زمانے میں فدا حسین رسول شاہی کا بھی زور شور تھا، مولانا نے فدا حسین کے فتنے کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس کے مریدوں کے پاس پہنچ کر اور ان کو پکڑ پکڑ کر

اور فدا حسین کے جلسوں میں جا جا کر امر بالمعروف کرنا شروع کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ فدا حسین کے کئی مرید تائب ہو کر مولانا کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اس پر فدا حسین کے مریدوں کو بہت صدمہ ہوا اور اس سے کہا کہ آپ مولانا پر تصرف کیوں نہیں کرتے، فدا حسین نے کہا کہ خبردار کبھی مولانا سے نہ اُلجھنا، ص ۷۵۔ دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ فدا حسین جب اکبری مسجد کے نیچے سے نکلتا جس میں شاہ عبدالقادر صاحب رہتے تھے تو بھاگ کر نکلتا، لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا جب میں اس مسجد کے نیچے سے نکلتا ہوں تو قلب میں جو ہوتا ہے سلب ہو جاتا ہے جب جب مسجد کی حد سے خارج ہوتا ہوں تو پھر آجاتا ہے" حکایات الاولیأ، طبع لاہور۔

حواشی

ابتدائیہ:

ا۔خواجہ حالی نے سرسیّد کا جو مکمل نصاب تعلیم حیات جاوید میں تحریر کیا ہے اِس کا اقتباس (انہی کے الفاظ میں) حسب ذیل ہے: فارسی میں انگلستان بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی شروع کی اور شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر المعانی، مطول پڑھیں۔ مگر عام طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ اس زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات میں سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا پھر پڑھنا چھوڑ دیا، اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی، ۴۶ء میں اُنھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی، اس وقت ان کو خیال آیا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھیں تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیا ہو گئی ہیں ان کو از سرِ نو غور و توجہ سے پڑھئے۔
چنانچہ کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ اور قدوری، شرح وقایہ، اصول شاشی، نور الانوار، مقامات حریری کے چند مقامے، سبعہ معلقہ کے چند قصیدے، مشکوٰۃ، ایک حصہ ترمذی اور کسی قدر اجزاء صحیح مسلم کے پڑھے، بس اس سے زیادہ جیسا کہ خود اقرار کرتے تھے استاد سے کچھ نہیں پڑھا، ص ۳۵ تا ۴۳
اب ساتذہ کے نام حالی ہی کی زبان سے سنئے، مولوی حمید الدین، نواب زین العابدین خاں (!) حکیم غلام حیدر خاں مشہور واعظ (؟) مولوی نوازش علی، مولوی فیض الحسن، مولوی مخصوص اللہ، ان میں سے کوئی بزرگ بھی صف اوّل کے اساتذہ و مدرسین نہیں تھے، حالی نے مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا نام بہت خصوصیت کے ساتھ لیا ہے اور بے شک وہ بعد میں شمس العلماء ہوئے۔ ہندوستان کے بہت بڑے عربی ادیب ہوئے، مصنف ہوئے، مگر جس وقت سرسید ان سے پڑھ رہے تھے وہ خود دہلی کے ایک گم نام طالب علم تھے اور عمر میں سرسید سے صرف ایک سال بڑے یعنی صرف تیس

سال کے تھے۔

۲۔ مثلاً علم الصرف، علم الکلام، تفسیر، اصول تفسیر، اصول حدیث۔

۳۔ ہندوستانی اخبار نویسی از محمد عتیق۔

۴۔ تصنیف و تالیف میں اعانت و شرکت سے بڑھ کر ایک اور صورت کا علی گڑھ کے ایک ''اولڈ بوائے'' نے انکشاف کیا، مولوی طفیل احمد لکھتے ہیں مسٹر بک (پرنسپل علی گڑھ کالج) برٹش انڈین ایسوسی ایشن (کلکتہ) مسٹر سریندر ناتھ بنرجی اور بنگالیوں کے مقابلے کیلئے انسٹی ٹیوٹ گزٹ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے انھوں نے گزٹ کی ادارت خود سنبھال لینے کی خواہش ظاہر کی جسے سرسید نے بخوشی منظور کرلیا۔ چنانچہ:۔ بک نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنا شروع کئے جو سرسید سے منسوب ہوئے'' ص ۲۷۸ مسلمانوں کا روشن مستقبل

۵۔ مولانا شبلی نعمانی نے بہت بعد میں اس طرف توجہ کی، مگر جب کی تو اس شان سے کی کہ ''سیرت نبوی'' جیسی معیاری کتاب تحریر فرمائی، جو اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے، بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے، استناداً استعمال ہوتی ہے، بار بار چھپ چکی ہے، کئی زبانوں میں ترجمہ کی گئی ہے اور خطبات احمدیہ دو تین بار چھپ کر رہ گئی۔

۶۔ اس دور میں مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ جیسے اساطین فلسفہ قدیم مسند درس پر متمکن تھے، ممکن ہے شمس الامراء دکن، شاہان اودھ اور دہلی کالج وغیرہ کے تراجم کی اشاعت سے طبیعیات قدیم وجدید کے یہ اختلافات، معرض بحث و کلام میں رہتے ہوں۔ چنانچہ مولانا فضل حق نے ہدیہ سعیدیہ میں اس اختلاف سے اعتنا کی ہے۔

۷۔ مثلاً ۱۸۵۹ء سے پہلے انہیں کبھی پبلک تقریر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

۸۔ ۱۸۵۲ء میں ''سلسلۃ الملوک'' کے نام سے جو جدول شائع کیا تھا، آثار کی اشاعت ثانی میں اس کو

باب اول کے طور پر ملحق کر دیا۔اس جدول میں ہر بادشاہ کے لئے ایک خانہ مخصوص کیا تھا،اس طرح شاہان دہلی کے خانے یوں تبدیل ہونے چاہئے تھے،شاہ عالم (جلوس ۱۷۵۹ء وفات ۱۸۰۶ء) اکبرشاہ ثانی جلوس ۱۸۰۶ء وفات ۱۸۳۷ء) بہادر شاہ ظفر (جلوس ۱۸۳۷ء)۔مگر چونکہ "جنرل لیک نے دہلی کو فتح کیا" اس لئے اب اس ترتیب سے شاہان انگلستان "خانہ نشین" کئے گئے ہیں۔شاہ جارج سوم (فتح دہلی سن ۱۸۰۳ء انتقال ۱۸۲۰ء) شاہ جارج چہارم (جلوس ۱۸۲۰ء انتقال ۱۸۳۰ء) شاہ ولیم چہارم (جلوس ۱۸۳۰ء انتقال ۱۸۳۷ء) ملکۂ وکٹوریہ (جلوس ۱۸۳۷ء)۔

۹۔۱۸۵۴ء میں جس کتاب کے لکھنے کا وہ ذکر کر رہے ہیں وہ آثار الصنادید (اشاعت ثانیہ) ہے،آثار کی یہ اشاعت اصل میں ۱۸۵۲ء میں طبع ہوگئی تھی۔مگر دیباچہ کی طباعت ۱۸۵۴ء میں ہوئی تھی اس لئے ۱۸۵۴ء میں اس کی اشاعت بتائی جاتی ہے مگر اس خیال کی تاریخ تو ۱۸۵۲ء ہی کی ہوئی!

۱۰۔مولانا حالی نے بڑی تفصیل سے اس مرض کا اعتراف کیا ہے۔

۱۱۔چاہے پھر اس حتمی اور قطعی رائے اور عقیدہ کی تردید ہی کیوں نہ کرنی پڑے،اور لطف یہ ہے کہ تردید بھی اسی شان قطعیت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔

۱۲۔"اسباب بغاوت ہند"۔"سرکشی بجنور" اور "لائل محمڈنز" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کا زمانہ تھا ہر طرف خوف و دہشت کا دور دورہ تھا اس لئے وہ قابل معافی ہیں مگر یہ "سیرت فریدیہ" ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی،کیا اس وقت بھی دہشت طاری تھی؟

۱۳۔مغل،اودھ،ٹیپو وغیرہ۔

۱۴۔علامہ تفضل حسین کا قیام لکھنؤ میں پہلی بار تو خود اپنے طلب علم کے دور میں رہا تھا،اور دوسری بار وہ ۱۷۸۲ء سے ۱۷۸۷ء تک پانچ سال لکھنؤ رہے،ظاہر ہے کہ خواجہ نے اسی پانچ سالوں میں سے کسی تین سالوں میں یہ سفر کیا ہوگا جب کہ وہ ۳۵ سے ۴۰ سال کے درمیاں تھے۔

۱۵۔اس وقت تک پنجاب پر انگریزوں کا تسلط نہیں ہوا تھا۔

۱۶۔اس کو انگریزی میں لوزنج LOZENGE بنالیا ہے۔

حواشی: سیرت فریدیہ:

۱۔۱۸برس کی عمر میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی تھی، بیس برس تک اپنے مرشد کے پاس الور ہی میں رہے، مرشد کی وفات کی بعد دہلی آگئے اور یہاں چالیس برس رہے پھر الور کے مہاراجہ نے بلالیا۔ چنانچہ الور ہی میں ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں رحلت کی، ص ۴۰ تذکرۂ اہل دہلی۔

۲۔یہ لفظ تہمت نہیں تہ بند ہے، جو کثرت استعمال سے تہمد ہو گیا ہے۔

۳۔یہ حضرت دہلی پر بہت بڑا اتہام ہے۔آخر علامہ تفضل حسین خاں نے بھی تو دہلی ہی میں تحصیل کی تھی پھر اسی دور میں علامہ فضل امام خیر آبادی ف ۱۸۲۹ء شاہ ولی اللہ ف ۱۷۶۲ء اور ان کے صاحبزادگان کرام شاہ عبدالعزیز ف ۱۸۲۴ء شاہ عبدالقادر ف ۱۸۱۴ء شاہ رفیع الدین ۱۸۱۷ء وغیرہ بکثرت ریاضیات کے فاضل و ماہر علماء موجود تھے۔

۴۔۱۸ رشوال ۱۲۱۵ھ ۱۷۹۹ء کے مطابق نہیں بلکہ ۱۸۰۱ء کے مطابق ہے۔

۵۔اس رسالہ کا ترجمہ اردو سر سید نے ۱۸۴۶ء میں کیا تھا، حیات جاوید۔

۶۔مدرسہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ کو کہا جاتا ہے جو ۱۷۸۰ء میں کمپنی نے قائم کیا تھا، اس مدرسہ کی ایک مفصل اور مستند تاریخ، اسی مدرسہ کے مدرس مولوی عبدالستار صاحب نے لکھی ہے۔اس تاریخ کی رو سے نہ صرف یہ کہ اُس وقت (۱۷۹۷ء میں) بلکہ کسی زمانے میں بھی اس مدرسہ میں سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ نہیں تھا اور خواجہ فریدالدین نام کے کوئی بزرگ کسی اور عہدہ پر بھی نظر نہیں آتے۔

۷۔احمد شاہ ابدالی کا پوتا زمان شاہ شروع ہی سے فتح ہند کا عزم رکھتا تھا، اور کمپنی کے لئے اس کا یہ عزم

دردجگر بنا ہوا تھا، زماں شاہ کے خطرے کا ازالہ کرنے کے لئے کمپنی نے متعدد تدابیر اختیار کیں ان میں سے ایک شاہ ایران سے کمپنی کا معاہدہ تھا۔ اسی معاہدہ کے نتیجہ میں جونہی زماں شاہ، پشاور کی طرف بڑھا فتح علی شاہ کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لئے اس نے اپنی فوجیں واپس بلالیں زماں شاہ دوبارہ عازم ہند ہوا تو کمپنی نے دوسری تدبیر اختیار کی کہ زماں شاہ کے بھائی محمود وغیرہ نے جو ایران میں پناہ گزیں تھے۔ افغانستان کا رُخ کیا، زماں شاہ پھر پشاور سے کابل لوٹا، دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی اور زماں شاہ گرفتار ہوا، محمود شاہ تخت نشین ہوا۔ اس طرح کمپنی نے اپنے قوی حریف و رقیب کو راستے سے ہٹا دیا اور افغانستان کو مستقل خانہ جنگی کا مرکز بنا دیا۔

۸۔ کمپنی سے برما کی پہلی جنگ ۱۸۲۴ء میں ہوئی تھی اس لئے اتنے پہلے کمپنی کی طرف سے کسی سفیر کا جانا کسی سیاسی و تجارتی معاہدہ کے لئے ہی ہوگا۔

۹۔ یہ ۱۷۸۸ء کا واقعہ ہے، میر تقی میر نے کہا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

۱۰۔ مراد ازاں غلام قادر خاں ہست۔ ۱۲ مولف (سرسید)

۱۱۔ مراد ازاں منظور علی خاں ناظر است۔ ۱۲ مولف (سرسید)

۱۲۔ بعد میں خواجہ فرید الدین کے اخلاف نے ''تحفہ نعمانیہ'' کو ''جوہرۂ فریدیہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ تفصیل مقدمہ میں ملاحظ ہو۔

۱۳۔ بڑا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تمام ملازموں اور عہدہ داروں اور خواصوں اور باری داروں کو جو چوکی پہرہ کو دن رات اپنی اپنی باری سے دیوان خاص اور خاص دیوڑھی اور دیگر مقامات خاص میں حاضر رہتے تھے پادشاہ کی طرف سے تیار ہو کر دیا جاتا تھا۔ ۱۲

۱۴۔ چھوٹا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تیار ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور بڑے بڑے امیر یا حکیم جو اپنی اپنی باری یا کسی ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے اُن کو بھیجا جاتا تھا۔۱۲

۱۵۔ جریب کا ملنا بادشاہی دربار میں اعزاز اور تقرب کی علامت تھی۔ دربار میں کھڑے رہنے کے لئے سہارے کے واسطے عصا ملتا تھا۔ کیونکہ دربارشاہی میں جملہ حاضرین ہر قسم کو کھڑا رہنا پڑتا تھا۔۱۲

۱۶۔ یہ تختِ طاؤس وہ تھا جو اصلی تخت طاؤس کے نادرشاہ کے زمانے میں لٹ جانے کے بعد محمد شاہ کے وقت میں بنایا گیا تھا۔ نہایت خوبصورت تھا اور بالکل شاہ جہاں کے تخت کی نقل تھا مگر لکڑی کا تھا اور نگینہ جو بجائے جواہرات جڑے گئے تھے وہ بھی اصلی نہ تھے۔ بہادر شاہ نے اپنے زمانۂ سلطنت میں ایک دوسرا تخت چاندی کا بنوایا تھا۔۱۲ (مؤلف) (سرسید)

۱۷۔ اکبر شاہ ثانی نے رام موہن رائے کو خط لکھا تھا وہ گویا ظاہر کرتا ہے کہ انگلستان سفیر روانہ کرنے کا منصوبہ خواجہ فریدالدین نے بنایا تھا اور اس مقصد کے لئے رام موہن رائے کا نام بھی اُنھوں نے ہی پیش کیا تھا، سرسید اس کو راجہ سکھ رائے کی طرف منسوب کر کے نادانی کی بات کہہ رہے ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظ ہو اخبار رنگین کا مقدمہ از ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی۔

۱۸۔ مفصل حالات شخصیات میں ملاحظ ہوں۔

۱۹۔ یہ انگریز جارج طامس تھا، بہادر شاہ نے: ”جارج طامس کی تحریر وتقریر کی بڑی تعریف سن کر بلایا اور اپنا ملازم کیا اس کے سامنے بہت سی قباحتیں بیان کیں وہ ان کی اصلاح کرائے۔۔۔۔اس فیصلہ کو جارج طامس بھی راجہ رام موہن رائے کی طرح منسوخ نہ کرا سکے“۔ ص۳۸۴ تاریخ ہند عہد انگلشیہ از ذکاءاللہ، جارج طامس کو صرف ایک وقت میں سترہ ہزار روپیہ لندن روانہ کئے گئے۔ بہادر شاہ کا روزنامچہ۔

۲۰۔ اسے کہتے ہیں حسن عقیدہ! کمپنی کی کیسی کیسی کھلی کھلی وعدہ خلافی اور صریح بدعہدی کی تاویل کی

جارہی ہے؟ فرنگی کی نیت شروع ہی سے بخیر نہیں تھی اور اس نے شاہ عالم کے وقت سے بہادر شاہ کے عہد تک بدعہدیوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا، شاہ عالم نے ۱۷۶۵ء میں کلایو کو الہ آباد مین سند دیوانی عطا کرنے کے فوراً بعد مطالبہ کیا کہ ''حسب وعدہ مجھے اپنی حفاظت میں دہلی پہنچاؤ''۔ مگر کلایو نے صاف انکار کر دیا کہ: ''یہ میرے بس کی بات نہیں اس کا انتظام شاہ انگلستان ہی کر سکتے ہیں ان سے کہو''۔ چنانچہ شاہ عالم نے ایک لاکھ روپئے کے قیمتی تحائف اور چار ہزار روپیہ بطور زادراہ دے کر مرزا اعتصام الدین اور کیپٹن سوئنٹین کو ۱۷۶۵ء مین انگلستان بھیجا لیکن کلایو وہ تحائف اور مراسلہ ہضم کر گیا، پیش ہونے اور منظور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا، آخر پونے تین سال کے بعد یہ وفد بے نیلِ مرام واپس لوٹ آیا۔ جب شاہ عالم مایوس ہو کر ۱۷۷۱ء میں از خود دہلی آگئے تو ہیس ٹنگز نے اس کو حیلہ بنا کر مال گذاری کی رقم دینا بند کر دی۔

پھر اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہیس ٹنگز نے دربار میں شاہ کے ساتھ مساوات وغیرہ کا مطالبہ کر کے تعلقات کو ناخوش گوار کر لیا، ۱۸۰۹ء میں مرزا جہانگیر کا حادثہ رونما ہو گیا، غرض یہ کہ کسی نہ کسی بہانے سے ماہانہ رقم پر ہاتھ صاف ہوتا رہا۔ اپنی شکایات کے ازالہ کیلئے خواجہ فریدالدین کو وزارت پیش کی گئی، مگر انھوں نے مقدمہ کی پیروی کرنے کے بجائے متوسلین شاہ کی تنخواہوں میں کمی اور قلعہ کے ساز و سامان کی فروخت شروع کر دی، جب مجبوراً ان کو برطرف کیا گیا تو ان کے خویش (سرسیّد کے والد سید محمد متقی خاں) نے دھمکی دی کہ خواجہ کلکتہ چلا گیا ہے وہ انگریزوں سے شکایت کر دے گا۔ لہٰذا پھر وزیر بنائے گئے۔ مگر اپنی وزارت کے عہد ثانی میں بھی اُنھوں نے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی یہ نتیجہ پھر وزارت چھوڑنا پڑی۔ مگر چلتے چلتے رام موہن رائے کو سفیر بنا کر لندن بھیجنے کی تجویز پیش کرتے گئے۔ چنانچہ رائے موہن کو شاہ نے کلکتہ سے بلایا، راجہ صاحب کا خطاب دیا اور مختار بنا کر بھیجنا چاہا، انگریزوں کو خبر لگی تو راجہ کو دھمکایا کہ اچھا ہماری شکایت لے کر جاتے ہو؟'' وہ بدنصیب دباؤ میں آ گیا اور جواب میں لکھا کہ ''میں سفیر شاہ کی حیثیت سے نہیں ایک شہری کی حیثیت سے جاؤں گا۔'' گویا خود اپنی سرکاری حیثیت تقریباً ختم کر دی، چنانچہ یہ وفد بھی ناکام رہا۔

آخر میں بہادر شاہ نے ہزاروں خرچ کر کے جارج طامس کو کلکتہ سے بلوایا اور سفیر بنا کر لندن بھیجا مگر یہ سعی بھی لا حاصل رہی اور نگریز کسی صورت سے ماہانہ رقم میں اضافہ پر راضی نہ ہوا۔

ان حقائق کو پس پُشت ڈال کران مظلوم و مرحوم سلاطین پر عہد شکنی کے الزامات عائد کرنا اور انگریز کی تائید و تصویب کرنا، سراسر دیانت و حق پرستی کے خلاف ہے!

۱۔ سفر خرچ تیس ہزار؟ کہیں یہ تین ہزار تو نہیں۔

۲۔ بخشی محمود خاں، نواب نجف خاں کے عزیزوں میں سے ہے، خوش بیان اور شاہی سواروں کا افسر ہے، امامیہ مذہب رکھتا ہے، ص ۲۹۴ علم و عمل۔

۲۱۔ خواجہ ہاشم علی خاں کے متعلق، سر سید کے سوانح نگار گراہم نے لکھا ہے کہ وہ انگریزوں کے اُسی قدر وفادار تھے جتنے خود سر سید۔ حیاتِ جاوید۔

کتابیات

آثار الصنادید:۔ سر سید احمد خاں۔ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

آثارات پھلواری:۔ حکیم محمد شعیب (پٹنہ ۱۹۵۳ء)

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند:۔ حکیم عبدالحئی (دمشق ۱۸۵۸ء)

الثورۃ الہندیہ:۔ (مولانا فضل حق خیر آبادی) مرتبہ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی (مدینہ پریس بجنور ۱۸۴۷ء)

اردوئے معلیٰ:۔ غالب (مطبوعہ)

اسباب بغاوت ہند:۔ سر سید احمد خاں۔ مرتبہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (کراچی ۱۸۵۷ء)

بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد:۔ رئیس احمد جعفری (کتاب منزل، لاہور ۱۸۵۷ء)

بہادر شاہ کا روزنامچہ:۔ شائع کردہ خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دہلی)

تاریخ سرکشی ضلع بجنور:۔ ڈاکٹر معین الحق (سلمان اکیڈیمی، کراچی ۱۹۶۲ء)

تاریخ عروج عہد سلطنت انگلسیہ:۔ ذکاءاللہ دہلوی (مطبوعہ دہلی)

تاریخ مدرسہ عالیہ:۔ مولوی عبدالستار (مدرسہ عالیہ ڈھاکہ ۱۹۵۹ء)

تذکرہ اہل دہلی:۔ (سر سید احمد خاں) مرتبہ، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۵ء)

تذکرہ علمائے ہند:۔ (رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۸۶۱ء)

تذکرہ فضل رحمان گنج مراد آبادی :۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ (لکھنؤ ۱۳۷۷ھ)

جوہرۂ فریدیہ :۔ فریدالدین خاں (مصلح المطابع دہلی)

حکایات الاولیاء :۔ مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی (مطبوعہ لاہور)

حواشی ابوالکلام آزاد : سید مسیح الحق، دہلی

حیات جاوید :۔ خواجہ الطاف حسین حالی (مفید عام پریس آگرہ ۱۹۰۳ء)

راجگان ہند :۔ نجم الغنی خاں رام پوری (ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء)

سر طامس مٹکاف کی ڈائری :۔ شائع کردہ خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دہلی)

سفینۃ الاولیاء :۔ محمد دارا شکوہ (نول کشور پریس ۱۸۸۴ء)

علم و عمل :۔ (وقائع عبدالقادر خانی) مرتبہ، ایوب قادری (ایجوکیشنل کانفرس، کراچی ۱۹۶۰ء)

عود ہندی :۔ غالب (مطبوعہ) ۱۹۴۱ء

قیصر التواریخ :۔ کمال الدین حیدر (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۷ء)

کلیات نثر (فارسی) غالب (نول کشور پریس لکھنؤ)

لائل محمڈنس آف انڈیا :۔ سر سید احمد خاں (مفصلائٹ پریس آگرہ ۲۔ ۱۸۶۱ء)

مسلمانوں کا روشن مستقبل :۔ طفیل احمد منگلوری (نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۶ء)

مکتوبات سر سید :۔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل (مجلس ترقی ادب لاہور)

ملفوظات شاہ عبدالعزیز :۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (مجتبائی پریس میرٹھ ۱۳۱۴ھ)

میمائرس آف حکیم احسن اللہ خاں :۔ مرتبہ ڈاکٹر معین الحق (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۵۹ء)

نزہتہ الخواطر (جلد ہفتم) حکیم عبدالحیٔ (دائرہ المعارف اسلامیہ، حیدر آباد ۱۹۵۹ء)
نفحات الانس:۔ عبدالرحمان جامی (نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۵ء)
نقوش آزاد: غلام رسول مہر، لاہور
واقعات دار الحکومت دہلی (جلد دوم) مولوی بشیر الدین احمد (آگرہ ۱۹۱۹ء)

اشاریہ

(شخصیات)

(آ)

آزاد بلگرامی ۳۴

آکٹرلونی، جنرل ۳۷-۴۴-۶۷-۶۸-۷۳-۷۴-۱۰۷

آیا سنگھ ۸۶

آتش ۳۴

آصف الدولہ، نواب ۵۳-۵۴-۶۷-۱۰۰

(ا)

ابراہیم خان، حاجی ۵۹

ابن العربی، محی الدین ۵۲

ابواسحاق ۵۰

ابواسحاق شیرازی، شیخ ۹۸

ابوالحسن علی ندوی ۱۱۲

ابوعلی فارندی، شیخ ۹۸

اجمل خان، حکیم ۱۱۰

احسن اللہ خان، حکیم ۲۴-۷۵-۱۰۲-۱۰۴-۱۱۰

احمد بسوی، خواجہ ۵۰-۹۸

احمد شاہ ابدالی ۳۴-۳۶

ارشد خاں، حکیم ۱۰۹

اسحق خان، حکیم ۱۰۹

استی بیوس ۱۰۹

اسماعیل خان، حکیم ۱۰۹

اسماعیل شہید، شاہ ۱۶-۱۱۳

اشرف، خواجہ ۵۱

اکبر شاہ ثانی ۳۷-۳۸-۴۶-۴۸-۴۹-۶۸-۶۹-۷۰-۱۰۲-۱۰۳

اکمل خان، حکیم ۱۰۹

الطاف حسین حالی، خواجہ ۷۶

الطاف حسین، منشی ۹۵

الٰہی بخش ۲۷

امام الدین خان، خواجہ ۱۰۷

امام غزالی ۱۶

امیر شاہ خاں ۱۱۳

انداتی، خواجہ ۹۸

(ب)

بخت خان ۲۷

بخشی محمود خان ۷۹

برج، لیفٹننٹ ۶۷

برن، کرنل ۶۷

بقا خان اعظم، حکیم ۱۰۹

بقراط ۱۰۹

بہادر شاہ ۲۴-۶۸-۶۹-۷۵-۸۳-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۶-۱۰۹-۱۱۰

بہادر خان ستارن ۸۵

بہاء الدین، خواجہ ۵۲_۱۱۲

(پ)

پامر، جنرل ۵۳_۱۰۰

(ت)

تفضل حسین، علامہ ۳۵_۴۶_۵۳_۱۰۰

تیمور شاہ، مرزا ۴۹_۶۶_۸۳

(ٹ)

ٹرولین ۷۷

(ث)

ثناء اللہ پانی پتی، قاضی ۳۴

(ج)

جان رسل کلارک ۱۰۵

جَنا (بی جنا) ۸۵

جہانگیر (مغل بادشاہ) ۱۰۹

چراغ علی خان ۶۱_۶۳

(ح)

حاتم ۳۴

حافظ شیرازی ۳۶

حالی ۱۹_۲۰_۴۱_۴۳

حسام الدین، خواجہ ۵۱_۵۲

حسن لکھنوی، ملا ۱۰۰

حبیب اللہ خاں، حکیم ۱۰۹

حسین علی مرزا، شاہزادہ ۶۳

حیات علی (خوش نویس) ۱۰۴

حیدر علی، مولوی ۱۰۵

(خ)

خلیل خان (حاجی) ۶۱_۶۲_۶۴

(د)

داراشکوہ_۹۸

(ذ)

ذکاء اللہ خان، حکیم ۱۰۲_۱۰۹

ذکاء اللہ، منشی ۱۰۱

(ر)

راجہ جی سکھ رائے ۴۶_۷۳

راگ رس خان ۱۰۸

رام موہن رائے، راجہ ۳۸_۴۲_۴۶_۷۳_۱۰۱

رائے پران کشن ۸۴_۸۵

رجب علی، منشی ۲۷

رجب علی مولوی ۷۷_۱۰۵_۱۰۶

رحیم النساء بیگم ۱۰۷

رستم علی خان، حکیم ۷۸_۱۰۶

رسول شاہ جی ۵۱_۸۱_۹۸

رضی الدین خان، حکیم ۱۱۰

رنجیت سنگھ، مہاراجہ ۳۸_۷۵_۷۶

(ز)
زمان شاہ ۳۶-۵۸-۵۹-۱۱۲
زیبا ۸۹-۹۴-۹۵
زین العابدین، خواجہ ۴۵
زین العابدین خان، نواب ۷۶-۷۸-۸۲-۸۳-۸۴-
۸۵-۸۶-۱۰۷

(س)
سچل سرمست ۳۴
سردار فتح سنگھ ۱۰۵
سعادت خان ۳۴
سعادت علی خان، نواب ۵۳-۵۴-۵۵-۵۷
سلیمان علیہ السلام ۱۰۹
سنائی، حکیم ۹۸
سیٹن ۶۸
سودا ۳۴
سید احمد خان، سر ۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۷-۱۸-۱۹-
۲۳-۲۴-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-
۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۵-
۳۶-۳۹-۴۰-۴۱-۴۳-۴۴-
۴۵-۴۷-۴۸-۷۴-۸۱-
۹۹-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۷-۱۰۸-
۱۰۹-۱۱۳
سید برکات احمد، حکیم ۱۰۳-۱۱۰
سید حامد ۱۳-۹۱-۱۰۹
سید خیر شاہ لاہوری، حکیم ۱۰۵
سید دائم علی عظیم آبادی، حکیم ۱۰۳

سید عبدالرسول (دیکھیے: رسول شاہ)
سید محمد حسن علی ۷۹
سید محمد خان ۱۳-۱۵-۹۱-۹۲-۹۳-۱۰۹
سید محمد متقی خان بہادر ۱۳-۳۷-۳۸-۷۰-۷۲-۸۶
سید محمود ۱۴-۱۵-۴۵-۹۱
سید مہدی علی، مولوی (محسن الملک) ۲۰

(ش)
شاہ آفاق ۱۱۲
شاہ جہاں (مغل بادشاہ) ۱۰۹
شاہ عالم ۳۵-۴۱-۵۸-۶۵-۶۸-
۶۹-۷۱-۷۵
شاہ عبدالعزیز دہلوی ۱۵-۲۳-۹۱-۹۸
شاہ عبدالقادر ۱۱۴
شاہ عبداللطیف بھٹائی ۳۴
شاہ غلام علی دہلوی ۳۴-۹۱
شاہ فدا حسین (دیکھیے نجیب الدین، خواجہ)
شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی ۳۴
شاہ نیاز احمد بریلوی ۳۴
شاہ محمد آفاق ۵۲-۱۱۱
شاہ ولی اللہ دہلوی ۳۴
شاہ ہمدان (دیکھیے یوسف ہمدانی، خواجہ)
شبلی، مولانا ۲۵-۴۳
شجاع الدولہ ۱۰۰
شریف خان، حکیم ۱۰۷-۱۰۹
شہاب الدین، خواجہ ۵۱-۵۲
شہاب الدین سہروردی، شیخ ۹۸،

شیخ فرید ۱۰۹
شیخ سمنانی ۹۸

(ص)
صادق علی خان، حکیم ۶۳_۱۰۹
صدرالدین آزردہ، مولوی ۱۰۵
صہبائی، مولانا ۱۹

(ض)
ضیاء الدین، خواجہ ۵۲_۱۱۱
ضیاء اللہ خواجہ ۱۱۲

(ظ)
ظہرالدین خان، حکیم ۱۱۰

(ع)
عبدالخالق غجدانی، خواجہ ۵۰_۹۸
عبدالرحمٰن جامی، مولانا ۹۸
عبدالرشید جونی، شیخ ۹۸
عبدالسلام خاں، حکیم ۱۰۹
عبدالعزیز، خواجہ ۵۱
عبدالقادر جیلانی، شیخ ۹۸
عبدالقادر، مولوی ۹۸_۹۹_۱۰۸
عبداللہ احرار، خواجہ ۵۰_۵۳
عبداللہ برقی، خواجہ ۵۰_۹۸
عبداللہ بغدادی ۱۰۵
عبداللہ جوینی، شیخ ۵۰

عزیز النساء بیگم ۸۷تا۹۶
علاء الدین، خواجہ ۵۱،۵۲،۱۱۲
علوی خان (معتمد الملک) ۱۰۹
علی حزیں، شیخ ۱۰۰
علی نقی خان، نواب ۸۳
علی وردی خان ۳۴

(غ)
غازی الدین خان ۳۵
غالب، مرزا ۲۴_۱۰۳_۱۱۰
غلام علی دہلوی، شاہ ۱۱۲
غلام نجف، حکیم ۹۱_۹۲_۱۰۳_۱۰۸_۱۰۹

(ف)
فاطمہ بیگم ۸۷
فتح علی شاہ قاچار ۳۶_۵۸_۵۹_۶۰_۶۲_۶۳
فخر النساء بیگم ۸۰_۸۷
فرید حسین، شاہ ۷۶_۱۱۳_۱۱۴
فرید الدین، خواجہ ۱۱_۳۴_۳۵_۳۶_۳_۳۸_
۳۹_۴۰_۴۳_۴۴_۴۵_
۴۶_۴۸_۴۹_۵۱_۵۲_
۵۳_۵۴_۵۶_۵۸_۶۲_
۶۳_۶۴_۶۵_۶۹_۷۰_
۷۱_۷۲_۷۳_۷۵_۷۶_
۷۷_۷۸_۸۰_۸۷_۱۰۶_
۱۰۷_۱۱۳
فضل امام، مولانا ۱۰۴

فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا ۱۱۲
فضل حق خیرآبادی ۲۷
فیروز شاہ ۲۷-۵۹
فیض الحسن سہارن پوری، مولانا ۱۱۳

(ق)

قطب الدین خان، نواب ۱۰۹

(ک)

کرامت علی، مولوی ۷۷-۱۰۴
کمال الدین، خواجہ ۵۱-۵۲
کول بروک ۷۷
کیدار ناتھ، راجہ ۷۳

(گ)

گارڈنر، جنرل ۷۳
گوراوزلی ۵۵-۵۶-۵۷

(ل)

لالہ ملوک چند ۸۲
لیک، لارڈ ۳۷-۶۷-۹۵
لوٹ ۶۰-۶۱-۶۲-۶۳

(م)

مارٹین، جنرل ۵۵-۵۶-۵۷
مارکوئیس آف ولزلی ۶۰-۶۱-۶۲-۶۹
مالکم (کپتان) ۵۹
مالکم (میجر) ۶۰-۶۱-۶۳
مجدد الف ثانی ۱۱۱
محمد احسن اللہ خان، حکیم ۱۰۹
محمد ایوب قادری ۱۲
محمد حسین، خلیفہ ۴۵
محمد حنیف، مولوی ۵۱-۹۹
محمد خلیل خان، حاجی ۵۹-۶۰
محمد شاہ ۳۴
محمد علی مونگیری، مولانا ۱۱۲
محمد مراد احراری، خواجہ ۵۳-۵۴
محمد مراد، خواجہ ۴۴
محمد میر خان، نواب ۷۳
محمد ناصر جان، خواجہ ۷۸
محمد نبی خان ۶۰-۶۲-۶۴
محمد نصیر، خواجہ ۸۴-۱۰۶
محمود خاں، حکیم ۱۱۰
محمود خان (نواب) ۲۷
محمود شاہ ۵۹
محی الدین، خواجہ ۵۲
مرزا بابر ۶۹
مرزا جہانگیر ۶۸-۶۹-۸۲-۸۳
مرزا محمد علی ابن مرزا خیر اللہ مہندس ۱۰۰
مرزا محمد نقی موسوی ۱۰۹
مرزا مظہر جانِ جاناں ۳۴
مرزا مہدی علی خان، نواب ۵۹-۶۰-۶۱-۶۳
مسیحا خاں، حکیم ۱۰۲-۱۰۹
مسیح الدین خان، حافظ ۱۰۸

مصلح الدین، خواجہ ۳۹-۴۰-۱۰۷
مگا شاہ ۳۹-۸۱
ممتاز محل، نواب ۶۸-۷۱-۷۳-۸۳
منٹو، لارڈ ۶۹
مومن ۲۶-۱۰۳
میر ۳۴
میر اثر، خواجہ ۱۰۶
میر حسن ۳۴
میر درد، خواجہ ۳۴-۷۸-۸۴-۱۰۶-۱۱۲
میر ناصر احمد ۸۴-۸۵
ناصر الدین احمد خان، حکیم ۱۱۰-۱۱۱

(ن)

نجم الغنی خان رامپوری، حکیم ۹۹
نجیب الدین، خواجہ ۵۱-۵۲
نظام الدین (سلطان) ۸۳
نعمت اللہ، شاہ ۹۸
نور احمد چشتی ۱۰۵
نور الحسن خان لکھنوی، نواب ۱۱۲
نور الحسن کاندھلوی، مولوی ۱۵
نور الدین، خواجہ ۵۱-۵۲

(و)

وجیہہ الدین، مولوی ۱۰۰
وحید الدین، خواجہ ۴۴-۸۲-۸۳-۱۰۷
وحید الدین سلیم، مولوی ۱۹
ولزلی، لارڈ (دیکھئے مارکوئیس آف ولزلی)
ولیم میور ۱۷-۲۰-۲۴

(ہ)

ہادی علوی شیرازی، حکیم ۱۰۹
ہاشم علی، خواجہ ۴۵-۸۲-۱۰۸
ہمت خاں ۱۰۸
ہنٹر ۱۷-۲۰-۲۲-۲۴
ہنری لارنس ۱۰۵
ہولکر ۶۷

(ی)

یوسف ہمدانی، خواجہ ۴۹-۵۰-۹۸-۱۱۳

اشاریہ

(اماکن)

(آ)

آگرہ ۱۳_۲۱_۳۰_۴۱_۱۰۲

(ا)

افغانستان ۵۹

الور ۵۲_۹۸_۱۱۳

الہ آباد ۶۹_۸۲_۸۳_۱۰۰

انبالہ ۱۰۵

انگلستان ۵۸_۱۰۲_۱۰۹

اوا ۳۷

اودھ ۳۴_۱۰۸

ایران ۳۶_۳۷_۴۹_۵۸_۵۹_۶۰_۶۱_۶۲_۶۳_۶۴

(ب)

باندہ ۳۷

بجنور ۱۴_۱۶_۱۹_۲۱_۲۷_۲۸_۹۴

بدایوں ۱۰۹

برما ۳۷_۶۵

بصرہ ۶۰_۶۲

بغداد ۵۰_۵۹

بمبئی ۵۹_۶۰_۶۱_۶۴

بنارس ۱۴_۱۵_۱۰۲

بندیل کھنڈ ۳۷_۶۵_۶۹

بنگال ۳۳_۳۴_۱۰۱

بوشہر ۵۹_۶۰_۶۱_۶۳_۶۴_۶۵

بھوپال ۱۰۵

(پ)

پانی پت ۶۷

پٹیالہ ۷۹

پشاور ۵۸

پنجاب ۳۴_۳۸_۷۸

پونا ۱۰۲

پھلواری شریف ۱۰۲

(ت)

تلونڈی (لدھیانہ) ۱۰۵

(ح)

حران ۱۰۹

حیدرآباد دکن ۶۰_۷۷_۱۰۴_۱۱۰

(خ)
خراسان ۵۰
خسرو (باغ) ۶۸
خوارزم ۵۰

(د)
دکن (دیکھئے حیدرآباد)
دہلی ۱۳_۱۶_۱۸_۲۳_۲۹_۳۲_ ۳۳_۳۴_۳۵_۳۷_۳۸_ ۴۰_۴۲_۴۶_۵۱_۵۲_۵۳_ ۵۸_۶۵_۶۷_۶۸_۷۰_ ۷۳_۷۵_۷۷_۸۳_۸۹_ ۹۱_۹۲_۹۳_۹۴_۹۹_۱۰۰_ ۱۰۲_۱۰۴_۱۰۵_۱۰۶_۱۰۷_ ۱۰۸_۱۰۹_۱۱۰_۱۱۱_۱۱۲_۱۱۳
راجپوتانہ ۱۰۵

(س)
سہارنپور ۶۷
سیالکوٹ ۱۰۰

(ش)
شیخوپور ۱۰۹
شیراز ۶۳_۶۴

(ط)
طبرستان ۱۰۹
طہران ۴۹_۶۳

(ع)
عراق عجم ۴۹_۵۰
علی گڑھ ۱۴_۲۱_۲۲_۴۷

(غ)
غازی پور ۱۴_۱۷
فتح پور سیکری ۱۳_۹۳
فرانس ۵۶_۵۸

(ک)
کانپور ۳۳
کراچی ۴۰
کشمیر ۵۰_۵۱_۵۳_۸۶
کلکتہ ۲۱_۳۶_۳۷_۳۸_۴۲_ ۴۶_۵۳_۵۶_۵۸_۶۰_ ۶۵_۶۹_۷۰_۷۱_۷۲_ ۷۳_۷۵_۱۰۰_۱۰۱_۱۰۲

(ل)
لاہور ۷۶_۱۰۵
لکھنو ۳۵_۳۶_۴۳_۵۲_۵۳_ ۵۴_۵۵_۵۸_۸۳_۱۰۰_ ۱۰۱
لندن ۱۷_۲۲_۳۸_۷۳_۷۵

(م)
ماوراالنہر ۵۰
متھرا ۶۷
مرادآباد ۱۴
مرو ۴۹_۵۰_۹۸
مغلپورہ ۱۱۲
میرٹھ ۹۴_۹۵_۹۶_۹۹

(ہ)
ہرات ۵۹
ہزاری باغ (بہار) ۱۰۱
ہمدان ۴۹
ہندوستان ۲۹_۳۳_۵۱_۵۸_۵۹_
۶۳_۶۴_۷۹_۸۴
ہوشنگ آباد ۱۰۵

'سیرت فریدیہ' سرسید احمد خان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد (۱۷۴۷ء تا ۱۸۲۸ء) کی مختصر سوانح ہے۔ ان کا دور وہ تھا کہ مرکز میں مغل بادشاہ محمد شاہ تخت نشین تھا، بنگال میں علی وردی خان کی صوبیداری تھی اور اودھ کے صوبہ دار سادات خاں تھے۔

اس مختصر کتاب میں سرسید احمد خان کے اباء واجداد خصوصاً نانا اور والدہ کا تفصیلی تذکرہ ہے اور والدہ کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کے کچھ واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کتاب حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے مرتب کی ہے۔ کتاب کے مقدمہ "ابتدائیہ" میں انہوں نے سرسید کی علمی وسیاسی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے، نہ صرف رسالہ پر حواشی تحریر کیئے ہیں بلکہ تعلیقات کے ضمن میں رسالے میں مذکور اشخاص کے حالات بھی تحریر کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے اور اس کی تفہم بھی آسان ہوگئی ہے۔

ISBN
978-969-8448-88-2